قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر: عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع: سید عبدالسلیم

مطبع: آفتاب عالم پریس

۱۳۔ ہسپتال روڈ۔ لاہور

فون۔ ۲۲۷۳۹۲

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۲
سیلابِ بلا	ادارہ	۸
علامہ اقبالؒ اور جدید اسلامی ریاست میں۔ تعبیرِ شریعت	ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ	۱۵
ملاوٹ	ڈاکٹر سید عبدالودود	۳۱
امن کی تلاش	آصف جلیل	۴۲
وحدتِ ملت	آفتاب عروج	۴۵
سرچشمۂ ہدایت	ثریا عندلیب	۴۶
قانون سازی میں قرآن اتفاقِ رائے	محمد ارشاد مری	۴۹
باتیں آصف جاوید کی	آصف جاوید	۵۲
حقائق و عبر	ادارہ	۵۳
نقد و نظر	ادارہ	۵۸
مغفرت	علی محمد چدھڑ	۶۰
نامے جو میرے نام آتے ہیں	ایڈیٹر	۶۴
جمہوریت	ادارہ	۶۷
اپنی کمائی (بچوں کے لئے)	غلام احمد پرویزؒ	۶۹
انگریزی مضامین		۷۱

جلد ۴۵ ——— اکتوبر ۱۹۹۲ء ——— شمارہ ۱۰

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: -/۱۰ روپے

لمعات

اقبالؒ ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ فلسفہ، اسلامی تاریخ، اسلامی لٹریچر اور پھر قرآن پاک پہ تفکر اور تدبر نے انہیں وہ نظر بخشی تھی کہ جس کا اشارہ انہی کے اس شعر سے ملتا ہے۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اور جو کچھ انہوں نے دیکھا اس کا نتیجہ وہ خیالات تھے جس کا انہوں نے اپنے خطبۂ الٰہ آباد میں مسلمانانِ برصغیر کے مستقبل کے متعلق اظہار کیا۔

فرمایا:۔

"اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقے میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں، یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رُو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پابگلِ مخلوق نہیں کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے بلکہ وہ ایسی بلند و بالا ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ اسی لئے میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کی جائے ــــ"

اور اسی خطبے میں انہوں نے اس بات کا اظہار بھی کیا کہ تاریخ کے سفر میں اسلامی اخلاقیات، معاشرت، اسلامی آئیڈیلز مقامی اثرات اور مسلمان اقوام کے زمانہ قبل از اسلام کے توہمات کے زیرِ اثر آہستہ آہستہ DE.ISLAMIZE ہو چکے ہیں، ہمیں اس زنگ کو اس پر سے کھرچ کر علیحدہ کرنا، اسے متحرک کرنا اور درخشاں قومی ہیئت دینی ہے — وہ ایسا کیوں چاہتے تھے —

"اس سے اسلام کو وہ موقع میسر آئے گا کہ عرب ملوکیت کی مہر اپنے آپ سے ہٹا سکے اور اسے موقع ملے کہ وہ اپنے کلچر، اپنی تہذیب، اپنے تمدن کو ایک طرف اپنی اصل روح سے ہم آہنگ کر سکے اور دوسری طرف زمانہ حال کی روح سے" اس طرح وہ اس برصغیر کے مسلمانوں کا مستقبل ہی محفوظ کرنا نہ چاہتے تھے بلکہ اس نئے ملک میں اسلام کو اس کی اصلی اور منزہ شکل میں نافذ کرنے کے متمنی تھے۔

یہی خیالات قائداعظمؒ کے تھے، عہدِ ملوکیت کا اسلام وہ بھی یہاں نافذ نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ فروری ۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام ایک پیغام براڈ کاسٹ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

"پاکستان کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیسی ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ بردار جمہوری انداز کا آئین ہوگا، اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرا سو سال پہلے ہو سکتے تھے، اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے، آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں، کچھ بھی ہو، یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں —"

علامہ اقبالؒ بہت پہلے فرما چکے تھے۔

حائل ہیں کیوں خالق و مخلوق میں پردے   پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

یہی وجہ تھی کہ روایتی مذہبی طبقہ قیامِ پاکستان کا مخالف تھا اور رہا، وہ بزعمِ خویش مذہب کو اپنی اجارہ داری سمجھتے ہیں۔

قائداعظمؒ نے مدتوں پہلے پیشوائیت کے علمبرداروں کی اجارہ داری کا انکار کر دیا تھا، مسلمان عوام پہ انہیں اعتماد

تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے ایک تازہ خطاب، جو انہوں نے جنگ فورم میں ارشاد فرمایا' قائد کا یہ قول ایک بار پھر یاد دلایا ہے ۔۔ عوام سے انہوں نے فرمایا "مسلم لیگ نے تمہیں ان لوگوں کے (UNDESIRABLE) غیر پسندیدہ چنگل سے آزادی دلا دی ہے جنہیں مولوی یا مولانا کہا جاتا ہے ۔۔"

قائد اعظم کو مہلت نہ ملی کہ ملتِ پاکستانیہ کو ایک ایسا آئین بنا کر دے جاتے کہ یہ باب ہی ختم ہو جاتا اور بعد میں وہ فتنے سر نہ اُٹھاتے جنہوں نے آج عوام کا جینا دوبھر کر رکھا ہے ۔۔۔

ان حضرات کا بہت بڑا طبقہ جو قیامِ پاکستان کا مخالف تھا وطنی قومیت کا حامی تھا اور بقول ڈاکٹر جاوید اقبال (زندہ رود) " ایسے علماء مسلمانوں کے قومیتِ متحدہ میں جذب ہو جانے اور یوں ہندوستان کی سیکولر یا لادین ریاست قبول کر لینے کو اسلامی تعلیمات کی رُو سے جائز سمجھتے ہیں مگر پاکستان میں وہ ایسا روایتی اسلامی نظام نافذ کرنے کے درپے ہیں جس کا آج کے متغیر زمانہ میں نفاذ مشکل ہے، ممکن ہے وہ ایسے نظام کی ناکامی سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہوں کہ مولانا حسین احمد مدنی کا مؤقف درست تھا اور علامہ اقبال کا غلط ۔۔"

اسی خطاب میں انہوں نے مولانا نجم الدین اصلاحی' کا قول دہرایا ہے جس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب زندہ رود میں بھی کیا ہے کہ " پاکستان جس اسلام کے نام پر بنا ہے وہ مرحوم (اقبال) ہی کے فلسفہ کا دوسرا نام ہے ۔۔۔"

خود اقبال کے متعلق جن کا ارشاد ہے کہ

" ہم ڈاکٹر صاحب مرحوم کو ایک شاعر اور فلسفی سے زیادہ حیثیت دینے کو شرعی جرم سمجھتے ہیں۔"

(زندہ رود' جلد ۳ صفحہ ۳۷)

اور اقبالؒ کا نظریہ کیا ہے ۔۔ 'زندہ رود' میں ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں۔

"آخر اقبال کا تصورِ اسلام کیا ہے' مختصراً یہی کہ ایک نیا مسلم معاشرہ وجود میں لایا جائے جو اجتہادی نقطہ نگاہ سے قرآن و سنت کی روشنی میں وقت کے جدید ترین تقاضوں کے مطابق اپنے تمام مسائل حل کرنے کی اہلیت رکھتا ہو ۔۔"

پاکستان جس مخمصے میں آج پھنسا ہوا ہے وہ یہی ہے۔

ضیاء الحق کے دور میں، انہی روایتی مولاناؤں کی سرپرستی اختیار کی گئی۔ واجد شمس الحسن MAG کراچی کے ایک تازہ شمارے میں لکھتے ہیں، ضیاء نے اپنے دور میں اسلام کو استعمال کرنے کے لئے خاص طبقے کی سرپرستی کی' اس نے نظامِ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کمیٹیاں قائم کیں جن کے ذریعے اس نے ان مولاناؤں' مشائخ اور مدرسوں کو کثیر رقوم دیں تاکہ اسلام کے اس نظریے کا رد کیا جا سکے جو انسان کو انسان کا استحصال کرنے کے خلاف جہاد کا حکم دیتا ہے' سماجی انصاف جو بقول شاہ ولی اللہ اسلام کا منشاء ہے' عام لوگوں تک نہ پہنچایا جا سکے ۔۔۔ یہ بات انہوں نے جسٹس منیر کی کتاب 'جناح

سے ضیاء، تک کے حوالے سے لکھی ہے۔

آج تک کسی نے اس بات پہ زور نہیں دیا، امت کو سمجھایا نہیں کہ آخر یہ لوگ پاکستان کے مخالف کیوں تھے۔ جمیعت علمائے اسلام (ہندوستان)، احرار، انصار اور دوسری چھوٹی چھوٹی جماعتیں سبھی قائداعظمؒ کی مخالف تھیں، خال خال کوئی ایسا نام نظر آتا ہے جو قائداعظمؒ کا مؤید تھا، یہ حضرات اس لئے وہاں رہ کر متحدہ قومیت کا جزو بن کر رہنے کو تیار تھے کہ بقول ان کے کانگریس انہیں مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ اقبالؒ نے یونہی نہیں کہا تھا۔

مُلا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

غور کرنے کا نقطہ یہی سجدے کی اجازت اور اسلام کی آزادی کا فرق ہے۔ سجدے کی آزادی میں ان مولانا حضرات کی شخصی قوانین میں اجارہ داری پہ حرف نہیں آتا تھا۔۔۔۔ پبلک لاز سارے ملک کے لئے یکساں اور پرسنل لاز ان کے دئے ہوئے۔

یہی کچھ یہ لوگ اب پاکستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں، ضیاء الحق صاحب ان کے مربی تھے۔ انہوں نے شریعت کورٹس بنائیں، مولانا حضرات کو ان میں ججوں کا مقام دیا اور یہ نظارہ بھی فلکِ چشم نے دیکھا کہ ایک شریعت کورٹ نے ایک فیصلہ دیا جو انہیں ناپسند تھا، ان کے ساتھ وابستہ مولاناؤں اور مشائخ کو پسند نہ تھا، چنانچہ وہ کورٹ اور اس کے جج تبدیل کردئے گئے اور نئی کورٹ نے نیا فیصلہ دیا۔۔۔۔ ملوکیت کے دَور کے فتاویٰ اور کیا تھے، آج بھی یہی آزمایا جارہا ہے۔

یہ جو آج چیخ و پکار اخباروں میں دکھائی دے رہی ہے وہ یہی ہے کہ ایک طرف حکومت ہی سے وابستہ مولانا ایک فتویٰ نما بیان دیتے ہیں تو اس پہ دوسرے وزراء اور وابستگانِ اقتدار اس کے خلاف بیان دیتے ہیں، ایک وزیر صاحب سود کے متعلق سوال اٹھاتے ہیں، وہ اس کا متبادل نظام مانگتے ہیں، تو ان کے خلاف واویلا مچایا جاتا ہے۔۔۔۔ کوئی پریکٹیکل حل پیش نہیں کرتا، شاید ان میں سے سمجھدار لوگ خود بھی جانتے ہیں کہ سرمایہ داری نجی ملکیت کو تقدس دینے والے نظام میں اس کے بغیر چارہ نہیں، سارے کے سارے نظام کو بدلنا ہی اس کا حل ہے اور وہ اقبالؒ اور جناحؒ کے تصورِ اسلام کے بغیر ممکن نہیں جس میں مذہبی پیشوائیت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

۱۹۴۱ء میں قائداعظمؒ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تو انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء سے خطاب کیا، طلباء نے ان سے سوال پوچھے، ان میں سے ایک سوال اور قائداعظمؒ کا جواب ملاحظہ ہو۔

سوال تھا،

جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریقِ کار دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں ذہنی میلانات اور تصوراتِ زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور رو بہ ترقی لاسکیں تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کردے ــــ

قائداعظمؒ کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ انہوں نے کہا۔

"دقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بلا اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں، ان امور کو چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت اور استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی ان کے اپنے سوا کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی، حالانکہ اس منصب کی بجاآوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے انہیں میں ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاء اللہ) نہیں پاتا (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔" (پمفلٹ متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی تتمہ ص ۹)۔

اسی لئے انہوں نے حتمی طور پر تھیاکریسی کو رد کر دیا تھا، ــــــ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ اللہ کے رستے میں دیوار ہیں ــــــ

پھر اس کا حل؟ جو STUFF اس وقت آپ کی اسمبلیوں میں ہے اسے آپ اجتہاد کا حق دے کر کیا امید رکھ سکتے ہیں، ــــــ کرنے کا کام نئی نسل کی تربیت تھی جس سے ہم نے یکسر غفلت برتی۔ اگر یہ کیا ہوتا اگر معیارِ تقویٰ ہوتا، علم ہوتا، پاکیزگی سیرت ہوتی، تو حالات مختلف ہوتے۔

مدتوں پہلے قائداعظمؒ نے اس طرف اشارہ کر دیا تھا، عید سعید ۱۹۴۵ء کے موقع پر اپنے پیغام میں انہوں نے کہا۔

"اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق ہے جو مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا، ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا

نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔"

(صفحہ ۴۷، قائداعظمؒ کے تصور کا پاکستان)

آزادی کے ان پینتالیس سالوں میں ہم نے تعلیم کی طرف سے غفلت برتی، تعلیم کا تناسب وہ بھی نہیں رہا جو آزادی کے وقت تھا۔ اقوامِ عالم میں شرحِ تعلیم کے سلسلے میں ہم ایک سو انیسویں مقام پر ہیں، تعلیم کے معیار کا بھی اللہ ہی حافظ ہے، نقل اور جعلسازی کے قصے روز اخباروں کی زینت ہوتے ہیں ـــــ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اور شے تربیت بھی ہوتی ہے، جس سے ہم بحیثیتِ مجموعی یکسر غافل ہیں ـــــ نتیجہ اس کا وہ نسل ہے جو ہر بیرونی اثر فوراً قبول کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے نظریات کو تعلیم کے نظام میں اس طرح جاری و ساری کریں جیسے جسمِ انسانی میں خون۔ صاحبِ ضربِ کلیم کی طرح ہمیں ایک نئی نسل تیار کرنا ہوگی، اس اثناء میں اگر موجودہ نسل آپس کے اختلافات کو ختم کرنے پر توجہ دے، فرقے، زبان، نسل، صوبائی عصبیت، یہ وہ چیزیں ہیں جو اختلاف و انتشار کا باعث ہیں، انہیں ختم کر کے اتحاد و اتفاق کی طرف لایا جائے، ہر ایک کو انصاف، ہر ایک کو حقوق کی ادائیگی کا یقین دلایا جائے، ایک صاف ستھری انتظامیہ، ایک بے لوث عدلیہ، مساوات پر مبنی معاشرہ کی تشکیل پر زور دیا جائے، ہر کام قانون کے مطابق ہونا شروع ہو جائے، تو رشوت جڑ سے اُکھڑ جائے اور آدھے مسائل حل ہو جائیں ـــــ آخر ایسی جمہوریتیں اس وقت بھی ہیں جہاں سائلوں کو دفتری چکروں میں پھنسا کر رشوت کی وصولی کی راہیں نہیں کھولی جاتیں، ہر بات قاعدے اور قانون کے مطابق ہو جاتی ہے ـــــ فی الحال اگر ہم اتنا ہی کر سکیں، تعلیم عام ہو، تربیت بہتر ہو، صاف ستھری کرپشن سے پاک، انتظامیہ اور عدلیہ ہو، انسانوں کی عزتِ نفس بحال ہو جائے تو درست سمت میں سفر شروع ہو جائے گا، خدا کے لئے اسلام کو وجہِ تنازعہ اور تفرقہ نہ بنائیں ـــــ اسلام امن کا، سلامتی کا، بھائی چارے کا، دلوں کو جوڑنے کا، مودت و محبت کو فروغ دینے والے نظام کا نام ہے۔

اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ اور رسولؐ کے محبوب بنو، تو
امانت میں خیانت نہ کرنا، سچی بات کہنا اور ہمسائے سے حُسنِ سلوک کرنا

(حدیثِ نبویؐ)

سیلابِ بلا

۱۱ ستمبر ۱۹۹۲ء

○ دریا بپھر گئے۔ ہزاروں افراد اور سینکڑوں بستیاں غرق۔

۱۳ ستمبر ۱۹۹۲ء

○ ہیڈ تریموں کے حفاظتی بند اڑا دیئے گئے۔ پنجند کو بچانے کی کوششیں۔ ۱۰۰ گاؤں ڈوب گئے۔

۱۴ ستمبر ۱۹۹۲ء

○ ۱۳ لاکھ ایکڑ پر فصلیں تباہ ۔ ۱۳ لاکھ افراد متاثر ہوئے۔ (وزیر اعلیٰ)

○ حکومت نے سیلاب کے بارے میں پیشگی اطلاع نہ دے کر مجرمانہ غفلت کا ارتکاب کیا ہے۔ (بینظیر)

○ وزیر اعظم نے سیلاب زدگان کی بحالی کے لئے مخیر لوگوں سے مدد کی اپیل کر دی۔

۱۵ ستمبر ۱۹۹۲ء

○ سیلاب موت اور بربادی چھوڑ کر آگے بڑھ رہا ہے۔ کھمبوں اور چھتوں پر بیٹھے بھوکے پیاسے لوگ امداد کے منتظر ہیں۔

○ ہر پاکستانی سجدے میں گر کر دعا کرے کہ اللہ ہمیں اس تباہی و بربادی سے بچائے۔ (وزیر اعظم)

○ کپاس اور گنے کی فصل تباہ۔ سینکڑوں کلومیٹر سڑکیں تباہ اور ٹیلیفون لائنوں کو نقصان پہنچا۔

۱۶ ستمبر ۱۹۹۲ء

○ بستیوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ انتظامیہ سیلاب آنے کے بعد کشتیاں تلاش کرتی رہی۔

○ بستیوں کی جگہ ملبے کے ڈھیر ہیں۔ ہر شخص کی اپنی الگ کہانی ہے۔

○ کہاں ہیں ہم سے ووٹ مانگنے والے۔ فوج نہ آتی تو شاید ہم زندہ بھی نہ بچتے۔ (عوام)

○ سیلاب زدہ علاقے میں مویشیوں کی چوری عروج پر پہنچ گئی۔

۱۷ ستمبر ۱۹۹۲ء

○ سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں قحط کی صورتِ حال۔ انسانوں اور جانوروں کی لاشیں بکھری پڑی ہیں۔
○ جو سیلاب سے بچ نکلے ہیں، بیماریوں سے نہ مرجائیں۔ خدارا کچھ کریں۔
○ ایک دانہ امداد بھی نہیں ملی۔
○ فلم بنوانے کے لئے بیلداروں کو قطاروں میں کھڑا کر کے آٹا گھی تقسیم کیا اور پھر واپس لے لیا۔
(مولانا اعظم طارق)
○ انتظامیہ نے وزیرِ اعظم اور وزیرِ اعلیٰ کے استقبال کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ (صوبائی وزیر ایکسائز)
○ جہیز بہہ گئے۔ رشتے ٹوٹ گئے۔ خوشیوں پر بھی پانی پھر گیا۔ (متاثرہ عوام)
○ "سیلاب کے معیشت پر بدترین اثرات ہوں گے۔"
"اربوں ڈالر کی ضرورت"

• شجاع آباد میں سینکڑوں بستیاں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔
• مظفر گڑھ سے پنجند تک کا علاقہ سمندر بن گیا۔
• سیلاب کا ریلا اب سمندر کی طرف بڑھ رہا ہے۔
• سیلاب کی ۱۷ ستمبر ۱۹۹۲ء تک کی مجموعی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ جنگ اپنے اداریئے میں رقمطراز ہے۔

جوں جوں وقت گزر رہا ہے اور سیلاب کے ریلے جنوبی پنجاب اور سندھ کے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں چند باتیں واضح ہو کر سامنے آ رہی ہیں۔ اس خیال کی صداقت میں اب کوئی کلام نہیں کہ حکومت سیلاب کے امکانات اور وسعت و سنگینی سے پوری طرح باخبر اور آگاہ نہیں تھی اور اس کے متعلقہ علاقوں کے لوگوں کو مطلع کرنے اور احتیاطی اور حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے لئے وہ سب کچھ نہیں کیا جس کی اس سے توقع کی جا سکتی تھی۔ اس حوالے سے اگر حکومت کی کارکردگی بہتر ہوتی، تو یقیناً لاکھوں لوگوں کو ان مشکلات اور مصائب سے بہت حد تک بچایا جا سکتا تھا جس سے وہ اب دوچار ہوئے ہیں اور اب تک دوچار چلے آ رہے ہیں۔ قومی اخبارات کی ٹیموں نے مختلف اضلاع میں جا کر جو برموقع براہِ راست معلومات حاصل کی ہیں ان سے یہ حقیقت کھل کر واضح ہو گئی ہے کہ عوام کو خطرے سے پیشگی طور پر مطلع کرنے کی کوئی کامیاب یا سنجیدہ کوشش نہیں کی جا سکی۔ جہلم اور جھنگ کے اضلاع سے جو تازہ اطلاعات موصول ہوئی ہیں وہ ظاہر کرتی ہیں کہ لوگ بالکل بے خبری میں مارے گئے اور ان کا وسیع جانی و مالی نقصان خطرے کی بروقت اطلاع نہ ملنے کے باعث ہوا۔ اس وجہ

سے ان اضلاع کے عوام میں شدید غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب کے منڈی بہاؤالدین اور ملکوال کے دوروں میں جس قسم کے عوامی ردِّ عمل کا اظہار ہوا ہے اس سے لوگوں کے موڈ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے دو تین روز قبل وزیر اعظم کے ضلع سرگودھا کے دورے کے موقع پر بھی ناموافق عوامی ردِّ عمل کا تذکرہ اخبارات میں آ چکا ہے۔ حکومت کو اس صورتِ حال سے کچھ سبق سیکھنے چاہئیں اور آئندہ کے لئے ایسی منصوبہ بندی کرنی چاہیئے کہ ہر قسم کے امکانی خطرات کی بروقت اطلاع نہ صرف حکومت تک پہنچ سکے بلکہ اسے ان تمام لوگوں تک بھی بروقت اور تیز رفتاری سے پہنچایا جا سکے جن کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو۔ حالیہ دنوں میں بعض سرکاری محکموں نے درپیش صورتِ حال کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالنے کی بھی کوشش کی ہے۔ حکومت کو یہ تعین کرنا چاہیئے کہ انتظامی مشینری کے کس کس کل پرزے سے غفلت، کوتاہی اور نااہلی کا ارتکاب ہوا ہے اور اسے قرار واقعی سزا دی جانی چاہیئے۔ جب تک احتساب کا اہتمام نہ کیا جائے گا اور ذمہ داری کا ٹھیک ٹھیک تعین نہیں ہوگا، آئندہ کے لئے اصلاحِ احوال کی توقع نہیں کی جا سکے گی۔

دوسری بات جو گذشتہ چند دنوں میں نمایاں طور پر محسوس کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ سیلاب بلا آجانے کے بعد حکومتی مشینری ایک مستعد، فرض شناس اور صاحبِ صلاحیت انتظامیہ کے طور پر کام نہیں کر سکی۔ مختلف محکموں میں ارتباطِ عمل اور کوآرڈی نیشن کا فقدان نظر آ رہا ہے۔ خود پنجاب کے وزیر بلدیات نے شکایت کی ہے کہ وہ جہاں بھی گئے، انہیں بعض محکموں کا کوئی اہلکار کہیں نظر نہیں آیا۔ پولیس اور سول انتظامیہ اپنے فرائض ادا کرنے میں کس طرح ناکام رہے۔ بلاشبہ صدر، وزیر اعظم اور وزرائے اعلیٰ ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں میں متاثرہ علاقوں کے دورے کر رہے ہیں اور بعض مقامات پر انہوں نے لوگوں سے خطاب بھی کیا ہے لیکن یہ سب کچھ پسندیدہ ہونے کے باوجود صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹی وی پر دکھائے جانے والے ریلیف کیمپوں کے باوجود تباہی کی مناسبت سے بڑے پیمانے پر مربوط امدادی کام شروع نہیں ہو سکا اور کچھ ایسا تاثر ابھر رہا ہے کہ حکومت اپنے آپ کو بے بس پا رہی ہے۔ متاثرہ علاقوں کے عوام فی الواقعہ بے مثال صبر و تحمل اور قوتِ برداشت کا مظاہرہ کر رہے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انتظامی مشینری ان کی مدد کے لئے وہ سب کچھ نہ کرے جو اسے کرنا چاہیئے۔ اگرچہ قدرے دیر ہو چکی ہے لیکن اب بھی وقت ہے کہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں فوری امداد کے کام کی جامع منصوبہ بندی کریں اور تمام وسائل بروئے کار لا کر مصائب میں گھرے ہوئے لوگوں کی مدد کا مؤثر اور جامع انتظام کریں۔ خدا کا شکر ہے کہ فوج نے امدادی کام کا کافی بوجھ اٹھایا ہوا ہے ورنہ مشکلات اور بھی زیادہ ہوتیں۔

سیلاب کی اب تک کی صورتحال سے جو تیسری بات واضح ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ نقصان کی شدت اور وسعت ابتدائی اندازوں سے کہیں زیادہ ہے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب نے صرف اپنے صوبے کو پہنچنے والے نقصان کا اندازہ پندرہ سولہ ارب روپے بتایا ہے جب کہ وفاقی حکومت نے پنجاب کے لئے صرف ایک سو کروڑ روپے کی امداد کا اعلان کیا ہے۔ سرحد، آزاد کشمیر

اور سندھ کے نقصانات کا اندازہ کرنا ابھی باقی ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہاں بھی بے حساب تباہی ہوئی ہے. صدر اور وزیر اعظم یہ عزم ظاہر کر چکے ہیں کہ وہ اپنے وسائل سے مشکلات اور مسائل کا مقابلہ کریں گے اور بین الاقوامی امداد کی اپیل نہیں کریں گے ہم ان کے اس عزم کا خیر مقدم کر چکے ہیں. مذکورہ عزم کا تقاضا یہ ہے کہ حکومت اتنے وسائل کا اہتمام کرے جو ہونے والے نقصان کی تلافی اور تعمیرِ نو کے لئے ضروری ہیں. اب تک کی اطلاعات کے مطابق حکومت نئے سرچارج، زکوٰۃ فنڈ اور بعض دوسری مدات سے صرف تین ارب روپے کا انتظام کر سکی ہے. ظاہر ہے کہ یہ رقم اونٹ کے مُنہ میں زیرے کے مترادف ہے. حکومت اگر غیر ملکی امداد کے لئے اپیل نہ کرنے کے فیصلے پر قائم ہے تو اسے واضح کرنا چاہیئے کہ وہ نقصانات کی تلافی کے لئے درکار بیس پچیس ارب روپے کا انتظام کس طرح کرنے کا ارادہ رکھتی ہے. موجودہ حالات میں عوام پر مزید ٹیکس تو عائد نہیں کئے جا سکتے. حکومت نے تاحال کوئی عندیہ نہیں دیا کہ وہ اپنے غیر پیداواری اخراجات میں کوئی بڑی کمی کرنے کے لئے تیار ہے. وزیر اعظم کے استعمال کے لئے نوّے کروڑ روپے سے جہاز خریدنے کا منصوبہ بھی اپنی جگہ قائم ہے نتھیا گلی کے گورنر ہاؤس کی تزئین و آرائش پر لاکھوں روپے خرچ کرنے کا تذکرہ بھی انہی دنوں اخبارات میں آیا ہے. اندریں حالات یہ واضح نہیں کہ حکومت نقصانات کی تلافی کے لئے درکار مالی وسائل کا اہتمام کس طرح کرے گی. ادھر یہ خبر بھی ہے کہ حکومت کے کہنے پر پاکستان میں انجمن اقوامِ متحدہ کے نمائندوں نے، پاکستان میں مقیم غیر ملکی سفارت کاروں کو سیلاب سے ہونے والے نقصان کے بارے میں بریفنگ دی ہے لیکن امداد کی کوئی باضابطہ اپیل نہیں کی گئی. سفارت کاروں کا ردِّ عمل یہ ہے کہ جب تک حکومت انہیں امداد کے لئے باضابطہ درخواست نہ کرے اور نقصانات کی متعین تفصیلات فراہم نہ کرے، وہ اپنی اپنی حکومتوں کو کوئی تجویز نہیں بھیج سکتے. بعض مغربی نشریاتی اداروں اور ملکی ماہرین نے رائے ظاہر کی ہے کہ حکومت کے پاس وسیع نقصانات کا مقابلہ کرنے کے لئے وسائل نہیں ہیں. لہٰذا یہ ضروری ہے کہ حکومت خوب سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کرے کہ اسے عالمی امداد کی اپیل کرنی ہے یا نہیں. ایسا نہ ہو کہ وقت گزر جانے کی وجہ سے ہم دوست اور ہمدرد ملکوں کی اعانت سے بھی محروم رہ جائیں اور اپنے وسائل سے بھی کماحقہ مقابلہ نہ کر سکیں. ایسا ہوا تو ملک کے کروڑوں عوام کو مناسب امداد نہیں مل سکے گی.

سیلاب کے بعد اشیائے ضرورت کی قلت اور گرانی کا ایک سلسلہ پہلے ہی شروع ہو چکا ہے اور کپاس، چاول، گنے مکئی، سبزیوں اور چارے کی فصلوں کو وسیع نقصان پہنچنے سے ان کی پیداوار کے ہدف پورے نہیں ہوں گے جس سے مزید گرانی اور چور بازاری کا ایک شیطانی چکر شروع ہو سکتا ہے. حکومت کو اپنی منصوبہ بندی میں درپیش صورتِ حال کے اس پہلو کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے اور ابھی سے اس کی پیش بندی کا اہتمام کرنا چاہیئے. سیلاب کی صورت میں ہم جس آزمائش سے دوچار ہوئے ہیں ابھی اس سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمیں بہت کچھ کرنا ہوگا اور حکومت کو اس بڑے چیلنج سے نمٹنے کے لئے اپنی جملہ صلاحیتیں اور وسائل بروئے کار لانے کا پختہ عزم کرنا چاہیئے."

ذرا سوچیئے کہ ہزاروں خاندان جو رات کو اپنی اچھی یا بُری چھت کے نیچے اطمینان سے سوئے تھے، صبح ہوتے ہی اس طرح خانماں برباد ہو جائیں کہ نہ پہننے کو کپڑا، نہ کھانے کو روٹی، نہ پاؤں ٹکانے کو دھرتی، نہ سر چھپانے کو چھپر۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ کسی کو علم نہیں کہ کون بچا اور کون مر گیا اور جو بچا ہے وہ کس حالت میں ہے اور کہاں ہے؟ اس سے بڑھ کر قیامت خیز تباہی اور کیا ہو گی؟ اگر کسی رات اتفاق سے بارش میں آپ کی چھت ٹپکنے لگ جائے تو سوچیئے کہ آپ کو کس قدر پریشانی ہوتی ہے؟ اس سے اندازہ لگایئے کہ ان لوگوں پر کیا بیتی ہو گی جن کا پورا گھر پانی میں ڈوب چکا ہو۔ اور ایک گھر نہیں بلکہ علاقے کا علاقہ زیرِ آب ہو اور، وہ جو قرآن نے (طوفان) حضرت نوحؑ کے ضمن میں کہا ہے لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ (۱۱/۴۳) "آج اس طوفانِ بلا انگیز سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی"۔ اس کا زندہ منظر آنکھوں کے سامنے ہو۔ قوموں کی زندگی میں ایسے حوادث کم آتے ہیں۔

لیکن قوم اور قوم میں بھی فرق ہے۔ اس قسم کے کائناتی حوادث زندہ قوموں پر بھی آتے ہیں۔ لیکن اوّل تو انہوں نے اپنی دُور نگہی سے ان کے لئے پہلے ہی حفاظتی تدابیر اختیار کر رکھی ہوتی ہیں اور اگر معاملہ ان کی حد سے آگے بڑھ جائے تو پوری کی پوری قوم اُٹھ کر انہیں اس طرح سنبھال لیتی ہے کہ افراد کو ان کے نقصان کا احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ حادثہ کے گذر جانے کے بعد قوم کے اربابِ حل و عقد سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہماری سابقہ تدابیر میں کیا کمی رہ گئی تھی اور اس کمی کو آئندہ کے لئے کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے لیکن ایک قوم ہمارے جیسی ہوتی ہے کہ سیلاب آتا ہے تو اخبارات میں بڑی بڑی جلی سرخیوں سے اس "قومی مصیبت" کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ لیڈرانِ قوم اپنے اپنے موٹروں پر موقعہ پر پہنچتے ہیں لیکن اپنے فوٹو اس انداز سے اتروا تے ہیں کہ کوئی پانی میں کھڑا غریبوں کو چاول بانٹ رہا ہے کوئی کیچڑ میں لت پت ان میں کپڑے تقسیم کر رہا ہے۔ ان کے یہ کارنامے اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ ان کیساتھ ہی ان کے بلند آہنگ دعاوی پر مشتمل بیانات کہ ہم مسئلہ چند روز میں حل کر کے دکھا دیں گے۔ دو تین دن تک یہ ہنگامہ رہتا ہے۔ سیلاب گذر جاتا ہے، تو یہ "قومی مصیبت" بھی ختم ہو جاتی ہے۔ لیڈر آرام کی نیند سو جاتے ہیں اور اپنے فوٹو اور اخبارات کے تراشوں کو سنبھال کر رکھ لیتے ہیں کہ آنے والے الیکشن میں "بوقتِ ضرورت" کام آئیں۔

یہ تو ہے ہمارے ہاں کے "دنیا داروں" کا حال۔ باقی رہے یہاں کے "دیندار" سو ان کے نزدیک یہ مسائل اُن سے بھی زیادہ آسان ہیں۔ جب کبھی اس قسم کے حوادث آتے ہیں تو وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان اور قوم کو تسکین دے لیتے ہیں کہ یہ سب ہماری شامتِ اعمال ہے۔ یہ ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ کہنے کو تو وہ "ہمارے گناہ" کہتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کی مراد ہوتی ہے "دنیا دار طبقہ" (اربابِ حکومت و قیادت) کے گناہ کیونکہ یہی وہ طبقہ ہے جو (ان کی اصطلاح میں) فسق و فجور میں مبتلا رہتا ہے، اور اسی کی وجہ سے خدا کا عذاب آتا ہے۔ یہ خیال کہ طبعی حوادث

مثلاً آندھیاں، بارشیں، سیلاب، زلزلے وغیرہ) خدا کا عذاب ہیں جو ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہم پر نازل ہوتا ہے، اس قدر عام ہے کہ اس کے متعلق ہمارے پاس اکثر استفسارات آتے رہتے ہیں۔ اس خیال کے عام ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کی نگاہ کو اس طرف آنے ہی نہیں دیا جاتا کہ فطرت کے طبعی حوادث کا علاج طبعی قوانینِ فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں اسی قسم کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ اس سے قوم مطمئن ہو جاتی ہے کہ یہ عذاب طبقۂ بالا کے فسق و فجور کی وجہ سے آتے ہیں اور چونکہ یہ خدا کی طرف سے ابتلا ہے اس لئے کوئی ان کی روک تھام نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان طبعی حوادث کو انسانوں کی نیکی اور بدی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر سیلاب لوگوں کے فسق و فجور کی وجہ سے آئے تو اسے فاسق و فاجر لوگوں کو تباہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ یہ فاسق و فاجر طبقہ تو اس عذاب سے محفوظ رہتا ہے اور پس جاتے ہیں۔ بیچارے غریب جو عام طور پر نیک ہوتے ہیں۔ یہ عجیب مکافاتِ عمل کا قانون ہے کہ کرے کوئی بھرے کوئی؟ امیروں کا طبقہ اوّل تو اپنے مکان ہی ایسی جگہ اور اس قسم کے بناتا ہے کہ وہ سیلاب سے بالعموم محفوظ رہیں اور اگر کبھی وہ اس کی زد میں آ بھی جائیں تو وہ اس سے بچنے کے ہزار سامان کر لیتے ہیں لیکن آگ لگے یا پانی برسے، غریبوں کے مکان سب سے پہلے تباہ ہوتے ہیں۔ افرادِ قوم سے آگے بڑھیئے، تو مختلف اقوامِ عالم ہمارے سامنے آتی ہیں۔ یورپ کی قومیں سب سے زیادہ "فسق و فجور" میں مبتلا رہتی ہیں اور مشرقی اقوام بالعموم مذہب پرست ہیں۔ لیکن دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ وہ قومیں اس قسم کے حوادث کے عواقب سے بالعموم محفوظ رہتی ہیں اور یہاں کی مذہب پرست قومیں ان سے زیادہ تباہ ہوتی ہیں۔ اقبالؔ کے الفاظ میں:

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان قوموں نے تسخیرِ فطرت کا راز سمجھ لیا ہے جس کی وجہ سے وہ فطرت کے ان حوادث کا مقابلہ اور ان کی روک تھام، خود قوانینِ فطرت کی رُو سے کرتی ہیں۔ ہالینڈ، پورے کا پورا ملک، سمندر کے ساحل پر واقع ہے اور سطحِ سمندر سے کتنے ہی فٹ نیچا۔ لیکن اس نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ سمندر کا ایک قطرہ پانی بھی ان کی "اجازت" کے بغیر ملک میں نہیں آ سکتا۔ اس کے برعکس، امریکہ کی بنجر زمینوں کو مصنوعی بارش سے سیراب کیا جا رہا ہے۔ جہاں زلزلے آتے ہیں وہاں مکانات ایسے تعمیر کئے جاتے ہیں جن پر زلزلہ اپنا اثر ہی نہ کر سکے۔ چین میں دریائے زرد کا نام ہی "بلائے موت" تھا۔ جب سے انسان نے آنکھ کھولی اس نے دیکھا کہ یہ دریا ہر سال اپنا رُخ بدل لیتا ہے اور لاکھوں کی تعداد انسانوں اور مویشیوں کی جانیں ہلاک اور بے حساب سامان و متاع تباہ و برباد کر دیتا ہے اس کا کوئی علاج چینیوں کی سمجھ میں آج تک نہیں آیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد چین کی حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس "بلائے ہلاکت" کے مُنہ میں لگام دینی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے ایک اسکیم تیار کی۔ کہتے ہیں کہ ان کا صدر ماؤزے تنگ، لبِ دریا گیا اور اسے مخاطب کر کے کہا کہ "اے زرد دریا! تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ اب یہاں عوام کی حکومت ہے۔ اس لئے تجھے اب اپنا رُخ ان کی مرضی کے مطابق رکھنا پڑیگا"۔

چنانچہ دریائے زرد کو یہ حکم ماننا پڑا اور اب وہ زمین پر ماتھا رگڑتا ہوا، ٹھیک اس راستے پر چلا جاتا ہے جو اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہاں کی حکومت، فاسق وفاجر تو ایک طرف، خدا تک کو نہیں مانتی۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ طبعی حوادث فطرت کے قوانین کے مطابق رونما ہوتے ہیں اور ان کا علاج انہی قوانین کی رُو سے ہوتا ہے۔ اس میں کفر و ایمان اور گناہ و ثواب کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ قرآن نے تسخیرِ فطرت کو "آدم" (یعنی آدمی) کے لئے عام بتایا ہے جب اس نے کہا ہے کہ وسخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض جمیعاً کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے ہم نے تمہارے لئے قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے، تو اس اعلان کا مخاطب "آدمی" ہے کوئی خاص گروہ نہیں۔ اس لئے دنیا کی جو قوم بھی چاہے تسخیرِ فطرت کر سکتی ہے جو قوم تسخیرِ فطرت کرے گی، وہ طبعی حوادث کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہے گی۔ جو ایسا نہ کرے گی وہ نقصان اٹھائے گی۔ اگر کوئی فاسق وفاجر (بلکہ ملحد اور دہریہ) برسات سے پہلے اپنے کوٹھے کی چھت لیپ لے گا تو بارش اسے کچھ نہیں کہے گی۔ اس کے برعکس اگر کوئی نمازی، پرہیزگار اس کی طرف سے لاپرواہی کرے گا تو بارش میں اس کی چھت ٹپکے گی۔ اس میں کسی کے لئے استثناء نہیں ہوتی۔

قرآن نے زندگی کی ایک سطح حیوانی بتائی ہے۔ حیوان فطرت کو مسخر نہیں کر سکتا۔ اس کے رحم وکرم پر رہتا ہے۔ دوسری سطح آدمیت کی ہے۔ آدمی فطرت کو مسخر کر سکتا ہے اور تیسری سطح مقامِ مومن کی ہے جس میں وہ تسخیرِ فطرت کے بعد، اپنی ذات کے نشوونما کے بھی قابل ہوتا ہے۔ جس کا طریق متاعِ فطرت کو نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عام کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی قوم مقامِ مومن تک نہیں پہنچ سکتی جب تک وہ پہلے مقامِ آدمیت تک نہ پہنچ جائے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں؛

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

مقامِ مومن تو خیر بہت دُور کی بات ہے۔ اگر پاکستان اِن سیلابِ حوادث سے محفوظ رہنا چاہتا ہے تو اسے کم از کم مقامِ آدمیت حاصل کرنا ہوگا۔ یعنی تسخیرِ فطرت اور تسخیرِ فطرت کے لئے قومی کردار (نیشنل کیریکٹر) کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ یہ انفرادی نہیں، اجتماعی کوششوں سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ فھل من مدکر؟

مومن میں بخل اور بدخلقی جمع نہیں ہوتی

حدیثِ نبویؐ

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

علامہ محمد اقبالؒ اور جدید اسلامی ریاست میں تعبیرِ شریعت کا اختیار

ابتدائیہ

علامہ محمد اقبالؒ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے افکار و نظریات کثیر الجہات ہیں۔ مصورِ پاکستان کی حیثیت، ان کے دیگر پہلوؤں پر غالب آگئی۔ اس تصور کو ایک حقیقت اور تحریک کی شکل دینے کے لئے انہوں نے جو شعر کہے، وہ حیات و کائنات پر ان کی دوسری شعری و نثری تعلیمات پر چھا گئے۔ یہ ایک فطری اور تاریخی، بلکہ تقاضا تھا۔ ایک محکوم قوم میں آزادی کی تمنا کی بیداری اور اس کے حصول کے لئے تازہ و صحت مند حرکی اور فکری غذا کی فراہمی ہندی مسلمان کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ جسے حکیم الامت نے اس کی غلامانہ اور مقلدانہ ذہنیت کی شفا کے لئے تجویز کیا۔ تحریکِ پاکستان میں جوشِ ایمان اور جذبۂ عمل کی عمودی اور اُفقی قوت ان کے شعروں کی مرہونِ منت تھی۔ جو انگریز کی جدید ترین عسکری اور برہمن کی قدیم ترین عیارانہ چالوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گئی۔ اس موقع پر علامہ کے اس تمام شعری کلام کے تکرار کی ضرورت نہیں جس نے مسلمان کے ذہن میں ہر وقت تازہ ہے۔ یہ علامہ کی شخصیت کا ایک پہلو ہے۔

ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب خواب حقیقت بن جائے اور ریاست معرضِ وجود میں آجائے تو تحریک کی قوت کو تعمیر کی طاقت میں کیسے بدلا جائے؟ میں "کلیاتِ اقبال فارسی"، اسرار و رموز، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد، ارمغانِ حجاز اور "کلیاتِ اقبال اردو"، بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز (اردو)، مکاتیب، ملفوظات اور ان کی انگریزی تخلیقات بالخصوص:

"The Reconstruction of Religious Thought in Islam"

کے عمیق مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ درحقیقت علامہ کی تعلیمات میں تعمیرِ ریاست پر جامع اور ٹھوس تخلیقی

مواد موجود ہے۔ اب یہ اہم سوال ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد تشکیلِ ریاست کے متعلق ان کے نظریات کیوں اہمیت حاصل نہ کر سکے؟ پاکستان میں بننے والے مختلف دساتیر میں ان کے تصورات کو کیوں جگہ نہ مل سکی؟ ریاستی اداروں: مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ کی تشکیل میں ان کے افکار سے کیوں استفادہ نہ کیا گیا؟ معاشرتی، معاشی، سیاسی تعلیمی اداروں کی ترتیب پر ان کے خیالات کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟ سائنسی، تکنیکی، تحقیقی اور تخلیقی ادارے ان کے تصورات پر کیوں قائم نہ ہوئے؟ کیا ریاستی اداروں کی تعمیر و تشکیل اور حکومتی امور و معاملات پر علامہ کی تعلیمات موجود نہیں؟ ایسا ہرگز نہیں۔ میرے اندازے کے مطابق علامہ کی تخلیقات کا سب سے زیادہ حصہ ایک جدید اسلامی ریاست کی تعمیر اور اس کے اداروں کی تشکیل سے متعلق اجتہادات پر مشتمل ہے۔

ایسی صورت میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اسے نظر انداز کیوں کیا گیا؟ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ پہلا یہ کہ تحریکِ پاکستان اور تعمیرِ پاکستان پر علامہ کی تعلیمات میں سے فطری اور تاریخی طور پر تحریک سے متعلق ان کے تصورات کو اوّلیت حاصل تھی۔ چنانچہ ان کی زندگی کے دوران اور قیامِ پاکستان تک وہ اشعار اور خطبات زبانِ زدِ عام ہو گئے۔ جو کفر کے مقابلے میں جوشِ ایمان اور جذبۂ عمل سے بھرپور تھے۔ جن میں قابلِ فخر ماضی اور روشن مستقبل کی نوید تھی۔ ان میں اسلامی عقائد و تعلیمات کی رعنائی اور مسلمانوں کے دلی جذبات و احساسات کی حسین انداز اور دلفریب اسلوب میں ترجمانی تھی۔ چنانچہ بلا امتیاز ہر طبقۂ خیال اور ہر طبقۂ معاشرت نے انہیں دل و جان کی گہرائیوں سے اپنا لیا۔ علامہ کے تحریکِ پاکستان سے متعلق پیام کی سحر میں مسلمان اتنا مسحور ہو گیا کہ وہ تعمیرِ پاکستان سے متعلق پیغام کی طرف توجہ نہ دے سکا اور سمجھ بیٹھا کہ اقبالؒ کا پیغام بس یہی ہے! دوسرا سبب یہ ہے کہ یہی متذکرہ اشعار و خطبات نصابِ تعلیم کا حصہ بن گئے۔ ذرائع ابلاغ بھی انہیں کی نشر و اشاعت میں لگ گئے۔ معاشرتی تہذیبی اور ثقافتی مجالس میں یہی پڑھے جانے لگے۔ اب نصف صدی گذر جانے کے باوجود تعمیرِ پاکستان سے متعلق ان کے افکار کو وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "ذہین لوگوں" نے اپنے طور پر "اجتہاد" کر کے قوم کا رُخ علامہ کے افکار سے مزار کی طرف موڑ دیا۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظمؒ اور قائدِ ملّت جلد وفات پا گئے۔ ان کے بعد کی سیاسی قیادت کے لئے جاگیرداری، سرمایہ داری، سول اور فوجی نوکر شاہی کے مفادات کا تحفظ تمام قومی اور ملکی تقاضوں پر اوّلیت اور فوقیت اختیار کر گیا، جس سے علامہ اقبال کے اشعار اور افکار کے انتخاب کا سوال پیدا کر لیا گیا۔ وہ اشعار و افکار جو ان طبقات کے مفادات کے استحصال کے کام آ سکتے تھے، عام کئے گئے اور جو ایک ترقی پسند جدید اسلامی ریاست کی تعمیر کے کام آ سکتے تھے، دبا دیئے گئے۔ چنانچہ نصابِ تعلیم، ذرائع ابلاغ، سرکاری، سماجی، مذہبی اور ثقافتی تقریبات کے لئے اوّل الذکر مفہوم کے اشعار کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس من پسند "انتخابِ اقبال" کو پوری قوت،

شدت اور اصرار کے ساتھ پیش کر کے قوم کو باور کرایا گیا کہ گویا اس "انتخاب" کے علاوہ علامہ اقبالؒ اپنے افکار سے خود دستبردار ہو گئے تھے!

قوم کے اہلِ علم و دانش کا فرض تھا کہ وہ قیامِ پاکستان کے بعد علامہ کے افکار کی ترجیحات کو از سرِ نو مرتب کرتے۔ ریاستی امور، حکومتی معاملات اور معاشرتی اداروں سے متعلق افکار کو اوّلین ترجیح دیتے۔ انہیں نصابِ تعلیم میں شامل کیا جاتا، ذرائع ابلاغ سے نشر و اشاعت کا اہتمام ہوتا اور معاشرتی زندگی میں انہیں رواج دیا جاتا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اس مقالے میں اسلامی ریاست سے متعلق علامہ کی تعلیمات میں سے صرف ایک ادارے سے متعلق ان کے افکار پیش کئے جاتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی تعلیمات میں ریاستی امور اور معاشرتی معاملات پر کتنا جامع اور واضح مواد موجود ہے جو دعوت دیتا ہے کہ قوم اسے استعمال میں لائے اور پاکستان کو ایک جدید اسلامی ریاست بنائے۔ اس مقالے میں حوالہ جاتی اقتباسات علامہ کی انگریزی کتاب؛

"The Reconstruction of Religious Thought In Islam"

سے لئے گئے ہیں۔

طرزِ حکومت

ایک جدید اسلامی ریاست میں تعبیرِ شریعت کے اختیار کا براہِ راست تعلق طرزِ حکومت سے ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک جمہوری طرزِ حکومت، روحِ اسلام کے عین مطابق ہے اور قانون سازی کا صحیح اور جائز حق ایک منتخب اسمبلی کو حاصل ہے۔ وہ ترکی کے اس اجتہاد کو روحِ اسلام کے عین مطابق قرار دیتے ہیں جس میں خلافت ایک منتخب اسمبلی کو تفویض کرنے کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ اس پر وہ اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں؛

"Personally, I believe the Turkish view is perfectly sound. It is hardly necessary to argue this point. The republican form of government is not only thoroughly consistent with the spirit of Islam, but has also become a necessity in view of the new forces that are set free in the world of Islam". (P—157)

"ذاتی طور پر میرا ایمان ہے کہ ترکی کا اجتہاد کُلّی طور پر جائز ہے۔ یہ اتنا درست ہے کہ اس کی تائید میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ ایک تو جمہوری طرزِ حکومت مکمل طور پر روحِ اسلام کے عین مطابق ہے۔ ثانیاً ان نئی قوتوں کے پیشِ نظر جو عالمِ اسلام

میں بیدار ہو چکی ہیں جمہوری طرزِ حکومت اور بھی ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔"

تعبیرِ شریعت پارلیمنٹ کا اختیار

اسلامی ریاست کی منتخب مقننہ کا بنیادی فریضہ تعبیرِ شریعت ہے۔ اس وقت یہی سب سے اہم مسئلہ قوم کو درپیش ہے کہ شریعت کی تعبیر کا اختیار کس کو حاصل ہے؟ کیا فقہی مسلکوں کے غیر منتخب افراد اس کا حق رکھتے ہیں یا تعبیرِ شریعت کا اختیار منتخب قومی اسمبلی کو حاصل ہے؟ تعبیرِ شریعت کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے۔ آیئے اس سوال پر علامہ اقبالؒ کے افکار سے رہنمائی حاصل کریں۔ وہ فرماتے ہیں:

"The transfer of the power of Ijtihad from the individual representatives of schools to a Muslim legislative assembly which, in view of the growth of opposing sects, is the only possible form Ijma can take in modern times, will secure contributions to legal discussion from laymen who happen to possess a deep insight into affairs. In this way alone we can stir into activity the dormant spirit of life in our legal system, and give it an evolutionary outlook". (P—174)

"فقہی مسلکوں کے انفرادی نمائندوں سے اجتہاد کا اختیار لے کر ایک مسلم قانون ساز اسمبلی کو منتقل کر دیا جائے۔ متحارب فرقوں کے پیدا ہو جانے کے پیشِ نظر عہدِ جدید میں یہی ایک صورت ممکن ہے جو اجتہاد اختیار کر سکتا ہے اور صرف اسی شکل میں عوام کی شرکت کو قانون سازی کے عمل میں یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ عوام، معاملات میں گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہی ایک واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنے فقہی نظام میں خوابیدہ روح کو از سرِ نو فعال اور متحرک بنا کر اسے ارتقائی شکل دے سکتے ہیں؟

تعبیرِ شریعت کا اختیار پارلیمنٹ کو کیوں؟

علامہ اقبالؒ کا جواب نہایت واضح اور دوٹوک ہے۔ ان کے نزدیک اب وقت آ گیا ہے کہ فقہی مسلکوں کے غیر منتخب نمائندوں سے اختیارِ اجتہاد لے کر اسے قوم کی منتخب اور نمائندہ قانون ساز اسمبلی کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فرقے دورِ ملوکیت اور استعمار کی پیداوار ہیں اور اب جمہوریت کا دور ہے۔ چوتھے خلیفہ راشد کی وفات کے بعد عہدِ بنو امیہ اور عہدِ بنو عباس میں تعبیرِ شریعت کا اختیار امت سے فقہی مسلکوں اور فرقوں کی طرف

منتقل ہو گیا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تعبیرِ شریعت کا اختیار فقہی مسلکوں کے افراد سے لے کر قوم کو منتقل کر دیا جائے جو اس کی اصل اور جائز حقدار ہے۔ وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے اس کا حق استعمال کرے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ متحارب فرقوں کی موجودگی میں عہدِ جدید میں یہی واحد شکل ممکن ہے جو اجتہاد اختیار کر سکتا ہے اور صرف اسی طریقے سے قانون سازی میں عوام کی شرکت کو یقینی بنایا جا سکتا ہے کیونکہ عوام ریاست و معاشرے کے معاملات میں گہری بصیرت کے مالک ہوتے ہیں اور ان کی شرکت کے بغیر قانون سازی بے جان اور بے نتیجہ رہتی ہے۔

علامہ کا اجتہاد غیر مبہم ہے۔ عہدِ جدید میں تعبیرِ شریعت کا اختیار صرف اور صرف منتخب قومی اسمبلی کو حاصل ہے ان کے اس اجتہاد کے دو بڑے سبب ہیں: پہلا سبب یہ ہے کہ فقہی مسلکوں کے افراد تعبیرِ شریعت کے اہل نہیں کیونکہ پوری قوم کی شریعت ایک ہے۔ جبکہ وہ ایک شریعت کی بجائے، مختلف اور متحارب فقہوں کے نمائندے ہیں۔ وہ اپنے فرقے کے لئے اپنی فقہ کی تعبیر تو کر سکتے ہیں مگر پوری قوم کے لئے شریعت کی تعبیر نہیں کر سکتے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام میں اختیارِ تعبیرِ شریعت پوری قوم کا حق ہے۔ خدا نے یہ اختیار کسی فرد یا طبقے کو تفویض نہیں کیا بلکہ اس کا اختیار پوری قوم کو دیا ہے۔ عہدِ رسالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ریاستی امور، حکومتی معاملات اور معاشرتی و معاشی اداروں کی تشکیل میں عوام کی رائے معلوم فرماتے تھے:

"وشاورھم فی الامر" قرآن (۳/۱۵۹)۔ (امورِ حکومت میں آپؐ ان سے مشورہ لیں) کا یہی مفہوم ہے۔ اس قرآنی اصول پر مبنی نظامِ حکومت "وامرھم شوریٰ بینھم" قرآن ۴۲/۳۸ (ان کے امورِ حکومت باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں) سے یہی مراد ہے۔ یہی سنتِ خلفائے راشدینؓ ہے۔ عوام میں سے عام مردوں اور عورتوں کی رائے کو ان عہدوں میں درست تعبیرِ شریعت قرار دیا گیا۔ قوم کو اللہ نے تعبیرِ شریعت کا جو اختیار دیا ہے وہ اسے آزادانہ رائے سے ہی استعمال کر سکتی ہے۔ جس کی عملی صورت یہ ہے کہ وہ آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخاب میں اپنے نمائندے منتخب کرے۔ جو ان کی نمائندگی میں تعبیرِ نو کا فریضہ انجام دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"ان اللہ لا یجمع امتی علی ضلالۃ"

"اللہ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔" (ترمذی، فتن، لزوم الجماعۃ)

تعبیرِ شریعت میں ایک فرد یا فرقہ یا طبقہ گمراہی اختیار کر سکتا ہے۔ مگر پوری قوم گمراہ نہیں ہو سکتی۔ تعبیرِ شریعت کی صلاحیت رکھنے والا، اچھی شہرت کا مالک، ہر بالغ مسلمان مرد و زن قانون ساز ادارے کی رکنیت کا اہل ہے۔ یہ صلاحیت قرآن و سنت کی تعلیمات، جدید علوم و تجربات اور درپیش قومی اور بین الاقوامی مسائل و معاملات کی مہارت پر مشتمل ہے۔ البتہ مالی ذرائع یا مذہبی حیثیت یا نسبی عصبیت یا علاقائی تعصب کا استحصال کرنے والا اس کی رکنیت

کا اہل نہیں، کیونکہ مال یا مذہب یا نسب یا علاقے کا استحصال قرآنی شرائط اخلاص اور تقویٰ کے منافی ہیں۔

اجتہاد کا دروازہ بند ہونا محض افسانہ ہے

علامہ اقبالؒ مسلسل اجتہاد کے قائل ہیں۔ وہ قاضی شوکانی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ اجتہاد تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بھی ہوتا رہا ہے۔ اس سے تو یہ امر قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اجتہاد کسی دور میں بند نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کا نظریہ محض افسانہ ہے۔
علامہ لکھتے ہیں:

"The closing of the door of Ijtihad is pure fiction." (P. 178)

"اجتہاد کا دروازہ بند ہونا محض افسانہ ہے۔"

افسانہ گھڑنے کے اسباب

علامہ نے اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے افسانے کے تین اسباب بیان کئے ہیں:
اوّل: فقہ معین صورت اختیار کر کے حرفِ آخر قرار پا گئی اور اسے دائمی حیثیت دے دی گئی:

"But contrary to the spirit of his own school the modern Hanafi legist has eternalized the interpretations of the founder or his immediate followers much in the same way as the early critics of Abu Hanifa eternalized the decision given on concrete cases."
(P. 178)

"عہدِ حاضر کے حنفی فقہاء نے اپنے مذہب کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہ یا ان کے شاگردوں کی تعبیرات کو دوامی حیثیت دے رکھی ہے۔ جس طرح شروع شروع میں امام ابوحنیفہ کے ناقدین نے ان فیصلوں کو دائمی حیثیت دے لی تھی جو مخصوص معاملات پر دیئے گئے تھے۔"

امام ابن تیمیہؒ نے فقہ کے حرفِ آخر ہونے کے خلاف سب سے پہلے زبردست ردِّ عمل کا اظہار کیا۔
علامہ لکھتے ہیں:

"Claiming freedom of Ijtihad for himself he rose in revolt against the finality of the schools, and went back to first principles in order to make a fresh start." (P.152)

"اپنے لئے اجتہاد کا دعویٰ کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ فقہی مذاہب کے حرفِ آخر ہونے کے خلاف بغاوت میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور شریعت کی از سرِ نو تعبیر کرنے کے لئے انہوں نے اوّلین اصولوں کی طرف رجوع کیا۔"

علامہ مزید لکھتے ہیں:۔

"But with all their comprehensiveness, these systems are after all individual interpretations, and as such cannot claim finality. I know the Ulama of Islam claim finality for popular schools of Muhammadan Law, though they never found it possible to deny the theoretical possibility of a complete Ijtihad." (P. 168)

"فقہی مذاہب اپنی جامعیت کے باوجود، بہرحال انفرادی تعبیرات ہیں اور حرفِ آخر ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتے۔ مجھے معلوم ہے کہ علماء فقہی مذاہب کے حرفِ آخر ہونے کے دعویدار ہیں۔ اگرچہ ان سے کبھی ممکن نہیں ہوا کہ وہ اجتہادِ مطلق کا انکار کر سکیں۔"

دوم: اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے افسانے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ذہنی تساہل اور روحانی انحطاط کی وجہ سے بڑے مجتہدین کو بُت بنا لیا گیا۔ علامہ لکھتے ہیں:

"and partly by that intellectual laziness, which especially in the period of spiritual decay, turns great thinkers into idols" (P.178)

"اور یہ بھی کہ ذہنی تساہل کی وجہ سے، بالخصوص روحانی انحطاط کے زمانے میں، ائمہ مجتہدین کو بُت بنا لیا جاتا ہے۔"

سوم: اجتہاد کی بندش کا تیسرا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ پہلے مجتہدین کو اجتہاد کی زیادہ سہولتیں حاصل تھیں جبکہ موجودہ مجتہدین کو زیادہ مشکلات درپیش ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے ان تینوں اسباب کا سختی سے رد کیا ہے۔ فقہ کے حرفِ آخر ہونے کا کوئی دینی اور علمی جواز موجود نہیں۔ فقہ کی زیادہ سے زیادہ حیثیت فقہاء کی انفرادی تعبیر کی ہے، جو انہوں نے

اپنے دَور کے مخصوص حالات میں کی تھی۔ اس کے دوام اور حرفِ آخر ہونے کی کوئی سند موجود نہیں۔ فقہ کے خود بانیوں کو اپنے اجتہادات اور تعبیرات کے حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہ تھا۔ فقہ کے دوام کا دعویٰ کرنے والوں سے علامہ اقبالؒ سوال کرتے ہیں:

"Did the founders of our schools ever claim finality for their reasonings and interpretations ? Never." (P. 168)

"کیا ہمارے فقہی مسلکوں کے بانیوں نے کبھی دعویٰ کیا تھا کہ ان کے اجتہادات اور تعبیرات حرفِ آخر ہیں ؟ کبھی نہیں"

ائمہ مجتہدین کو بُت بنانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا شریعت میں کوئی جواز ہے بلکہ اس کا اصل سبب ذہنی تساہل (INTELLECTUAL LAZINESS) اور روحانی انحطاط (SPIRITUAL DECAY) تھا۔ جس کی وجہ سے بعد کے فقہاء اجتہاد نہ کر سکے اور متقدمین فقہاء کے بارے میں ایسا تصور پیدا ہو گیا جو ایسے حالات میں عموماً پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

اب اجتہاد کے زیادہ مواقع موجود ہیں

علامہ نے تیسرے مفروضے کے جواب میں لکھا کہ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد اور انتہائی نامعقول ہے کہ پہلے مجتہدین کو اجتہاد کی زیادہ سہولتیں حاصل تھیں اور موجودہ مجتہدین کو زیادہ مشکلات درپیش ہیں۔ انہوں نے اس افسانے کو بیہودہ قرار دیا اور واضح کیا کہ دراصل موجودہ مجتہدین کو پہلوں کی نسبت زیادہ سہولتیں میسّر ہیں۔ اس پر سرخسی کے حوالے سے علامہ نے یہ رائے دی ہے:

"If the upholders of this fiction mean the later writers had more difficulties in their way, it is nonsense; for it does not require much understanding to see that Ijtihad for later doctors is easier than for the earlier doctors. Indeed the commentaries on the Quran and **Sunnah have been compiled and multiplied to such an extent that** the Mujtahid of to-day has more material for interpretation than he needs." (P. 178)

"اس افسانے کے حامی اگر یہ سمجھتے ہیں کہ متاخرین فقہاء کے راستے میں زیادہ مشکلات ہیں

تو انتہائی بے ہودہ بات ہے۔ کیونکہ اسے سمجھنے کے لئے زیادہ عقل درکار نہیں کہ متاخرین فقہاء کے لئے متقدمین فقہاء کی نسبت اجتہاد کرنا زیادہ آسان ہے۔ درحقیقت قرآن کی تفاسیر اور سنّت کی شروح کا ذخیرہ اس کثرت سے مدوّن اور عام ہو چکا ہے کہ آج کے مجتہد کے پاس تعبیرِ شریعت کے لئے اس کی ضرورت سے بھی زیادہ مواد موجود ہے۔"

علامہ نے اپنے مدلّل جواب سے اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کو محض افسانہ قرار دیا اور ثابت کیا کہ اس کو گھڑنے والوں کے پاس کوئی دینی، علمی اور قانونی جواز موجود نہیں۔ عہدِ حاضر کے مسلمانوں کو انشراحِ صدر کے ساتھ اجتہاد کرنا چاہیئے۔ انہیں بغیر کسی خوف کے شریعت کی تعبیرِ نو کا اختیار استعمال کرنا چاہیئے۔ یہ ان کا حق ہے وہ اپنے حق سے کسی صورت دستبردار نہ ہوں۔ علامہ فرماتے ہیں:

"modern Islam is not bound by this voluntary surrender of intellectual independence" (P. 178)

"عہدِ حاضر کے مسلمان کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ وہ اپنی ذہنی آزادی سے خود بخود دست بردار ہو جائیں۔"

علامہ نے وسیع النظر اور وسیع الفکر مسلمانوں کی نئی نسل کے اس اختیار کا مکمل جواز پیش کیا جس میں اس نے شریعت کی ازسرِنو تعبیر کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"The claim of the present generation of muslim liberals to re-interpret the foundational legal principles, in the light of their own experience and the altered conditions of modern life is, in my opinion, perfectly justified." (P. 168)

"عہدِ حاضر کے وسیع النظر مسلمان اگر دعویٰ کرتے ہیں کہ نئے تجربات کی روشنی اور زندگی کے بدلے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر انہیں شریعت کے بنیادی قانونی اصولوں کی ازسرِنو تعبیر کا حق حاصل ہے تو میری رائے میں ان کا دعویٰ کلی طور پر جائز ہے۔"

علماء کی نامزد کونسل

علامہ ہر حالت میں قانون ساز اسمبلی کی بالادستی کے قائل ہیں۔ وہ علماء کی کسی نامزد کونسل کو اسمبلی کی نگرانی پر

برداشت نہیں کرتے۔ انہوں نے ۱۹۰۶ء کے ایرانی دستور میں علماء کی نگران کونسل کی شق پر سخت تنقید کے بعد اسے خطرناک قرار دیا۔ ان کی رائے میں علماء بھی اسمبلی کا حصہ بنیں۔ اس کی آزادانہ قانونی بحثوں میں مدد اور رہنمائی کی خدمات انجام دیں۔ مگر وہ علماء کو نامزدگی کے ذریعے اسمبلی کی نگرانی پر مسلط کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔

کیا اسمبلی گذشتہ تعبیرِ شریعت کی پابند ہے؟

ایک جدید اسلامی ریاست کی مقننہ کے اختیارات کے ضمن میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ اسمبلی گذشتہ زمانوں میں کی ہوئی شریعت کی تعبیر اور فقہاء کے اجتہادات کی پابند ہے؟ اس مسئلے پر علامہ کا اجتہاد یہ ہے کہ موجودہ اسمبلی اس کی پابند نہیں، کیونکہ جیسے بیان ہو چکا ہے گذشتہ دور کی فقہ کے خود بانیوں کو اپنے اجتہادات اور تعبیرات کے حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہ تھا۔

علامہ کی رائے میں گذشتہ فقہی افکار فرسودہ ہو چکے ہیں اور کسی قوم کے فرسودہ افکار اس کے احیاء و تجدید کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ انہوں نے اپنے اس خیال کی تائید میں یہ رائے پیش کی ہے:

"The verdict of history is that worn out ideas have never risen to power among a people who have worn them out". (P. 151)

"تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن فرسودہ تصورات کو خود کسی قوم نے فرسودہ قرار دے دیا ہو۔ وہ اس قوم میں کبھی قوت حاصل نہیں کر سکتے۔"

ان کی رائے میں گذشتہ اجتہادات اب مفید نہیں رہے۔ جدید افکار اور تجربات کی روشنی میں آزادیٔ اجتہاد کو بروئے کار لا کر قوانینِ شریعت کی از سرِ نو تشکیل کی ضرورت ہے۔ اس اصول پر علامہ نے ترکی کے سعید حلیم پاشا کی رائے سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے اسے پیش کیا ہے:

"The only alternative open to us, then, is to tear off from Islam the hard crust which has immobilized an essentially dynamic outlook on life, and to rediscover the original verities of freedom, equality, and solidarity with a view to rebuild our moral, social, and political ideals out of their original simplicity and universality" (P. 156)

"اب کوئی چارہ کار ہے تو یہ کہ ہم اس چھلکے کو اتار پھینکیں جو سختی کے ساتھ اسلام پر جم

گیا ہے۔ جس نے مکمل طور پر متحرک نظریۂ حیات کو بالکل جامد بنا کر رکھ دیا ہے۔ حریت، مساوات اور وحدت کی اصل صداقتوں کو پھر سے منکشف کریں، تاکہ اپنے اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی اعلیٰ مقاصد کی از سرِ نو تعبیر ان کے اصلی، سادہ اور عالمگیر نقطۂ نظر سے کر سکیں۔"

علامہ اقبالؒ کا نظریہ ہے کہ جو چیز فرسودہ ہو کر بے جان ہو چکی ہو موجودہ اسمبلی اس کی پابند نہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ جھوٹی عقیدت کا اظہار اور مصنوعی ذرائع سے اس کا احیاء زوال پذیر قوم کا علاج ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"Thus a false reverence for past history and its artificial resurrection constitute no remedy for a people's decay" (P. 151)

"قوم کے زوال و انحطاط کو روکنے کا یہ علاج نہیں کہ گذشتہ تاریخ سے جھوٹی عقیدت کا اظہار کیا جائے اور اس کے احیاء کے لئے خود ساختہ اور مصنوعی ذرائع اختیار کئے جائیں۔"

علامہ کے ان افکار سے یہ اصول پوری طرح واضح ہو گیا کہ وہ مجلسِ قانون ساز کو کلی طور پر آزاد اور خود مختار سمجھتے ہیں۔ وہ اس کے مکمل اختیارِ تعبیرِ شریعت کے قائل ہیں۔ وہ فقہی مسالک سے قومی اسمبلی کو بالا قرار دیتے ہیں اور اسمبلی پر کسی بھی فقہی مسلک کی بالادستی کو برداشت نہیں کرتے۔

کیا اسمبلی صحابہؓ کے فیصلے کی پابند ہے؟

جدید اسلامی ریاست کی مقننہ کے اختیارات اجتہاد اور تعبیرِ نو کی بحث میں علامہ نے ایک نہایت حساس سوال اٹھایا ہے۔ وہ یہ کہ کیا بعد کے مسلمان صحابہؓ کے کسی اجماعی فیصلے کے پابند ہیں؟

"But supposing the Companions have unanimously decided a certain point, the further question is whether later generations are bound by their decision"? (P. 175)

"بالفرض اگر صحابہؓ نے کسی مسئلے پر اجماعی فیصلہ دے رکھا ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بعد کے مسلمان ان کے فیصلے کے پابند ہیں؟"

اس مسئلہ پر امام شوکانی کی بحث کے بعد علامہ اقبالؒ صحابہؓ کے "امرِ واقعی" اور "امرِ قانونی" پر فیصلوں میں تمیز کا بنیادی اصول پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"I think it is necessary in this connection to discriminate between a decision relating to a question of fact and the one relating to a question of law". (P. 175)

"میری رائے میں یہ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں امرِ واقعی سے متعلق فیصلے اور امرِ قانونی سے متعلق فیصلے میں تمیز کی جائے۔"

علامہ اس اصول کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

"In the former case, as for instance, when the question arose whether the two small Suras known as "Muavazatain" formed part of the Quran or not, and the Companions unanimously decided that they did, we are bound by their decision. Obviously because the Companions alone were in a position to know the fact".

"اوّل الذکر معاملے (امرِ واقعی) میں مثلاً، جب یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کیا "موذتین" نام کی دو چھوٹی سورتیں قرآن کا حصہ ہیں یا نہیں اور صحابہؓ نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ وہ قرآن کا حصہ ہیں، تو ہم ان کے فیصلے کے پابند ہیں، بدیہی طور پر، کیونکہ اس معاملے میں صحابہ اس حیثیت میں تھے کہ انہیں اس کا علم ہوتا۔"

اس کے بعد علامہ دوسرے معاملے "امرِ قانونی" کے بارے میں اپنا اصول اس طرح بیان کرتے ہیں:

"In the latter case the question is one of interpretation only, and I venture to think, on the authority of Karkhi, that later generations are not bound by the decision of the companions. Says Karkhi : The Sunnah of the companions is binding in matters which cannot be cleared up by Qiyas, but it is not so in matters which can be established by Qiyas" (P. 175)

"مؤخر الذکر معاملے (امرِ قانونی) کی صورت میں یہ مسئلہ محض تعبیر اور اجتہاد کا ہے۔ لہٰذا میں کرخی کی سند پر یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ بعد کے مسلمان، صحابہ کے فیصلے کے پابند نہیں۔ کرخی کا قول ہے کہ صحابہ کی سنّت ان معاملات میں لازم ہے جن میں قیاس سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ مگر جن معاملات میں قیاس سے کام لیا جا سکتا ہے ان کی پابندی

لازم نہیں۔"

اسمبلی اجتہادِ مطلق کا اختیار رکھتی ہے

فقہی اصطلاح میں علامہ کے نزدیک قومی اسمبلی کو اجتہادِ مطلق کا اختیار حاصل ہے۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"In this paper, I am concerned with the first degree of Ijtihad only, i.e. complete authority in legislation". (P. 149)

"میں اس خطبے میں صرف اجتہاد کے درجہ اوّل کو زیرِ بحث لاؤں گا۔ یعنی قانون سازی میں اجتہادِ مطلق کے اختیار کو۔"

فقہ میں اجتہاد مطلق درجہ اوّل کا اجتہاد ہے۔ اور جو شخص یہ اجتہاد کرے وہ مجتہد مطلق کہلاتا ہے۔ جو اجتہاد کے اصول اور اس کے قواعد و ضوابط خود وضع کرتا ہے وہ دوسروں کے اصول و قواعد کا پابند نہیں ہوتا۔ جو دوسروں کے اصولوں کی پابندی کرے وہ مجتہد منتسب ہوتا ہے۔ وہ دوسرے درجے کا مجتہد کہلاتا ہے۔ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ جس امام کو اس نے مجتہدِ مطلق تسلیم کیا ہو اس کے اصولوں کی پابندی میں اجتہاد کرے۔

علامہ اقبالؒ اجتہاد کے درجہ اوّل "FIRST DEGREE IJTIHAD" اجتہادِ مطلق "COMPLETE AUTHORITY IN LEGISLATION" کے داعی ہیں۔ وہ خود مجتہد مطلق ہیں۔ ان دو اصطلاحوں کا استعمال وہ اپنے قلم سے خود کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اجتہاد کے اصول خود وضع کئے ہیں اور انہیں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے ماٰخذ شریعت: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس پر جو بحث کی ہے وہ نہایت بصیرت افروز ہے جس سے ان کے اجتہاد کے وضع کردہ قواعد و ضوابط واضح ہوتے ہیں۔ وہ انفرادی اجتہادات سے قوم کے منتخب نمائندوں کی رہنمائی کریں۔ مگر ان کے نزدیک عہدِ حاضر میں ملکی قوانین کی تقنین اور تشکیل کے لئے اجتماعی اجتہاد و تعبیر نو قانون ساز اسمبلی کا اختیار ہے۔ لہٰذا ان کے رہنما اصولوں اور قواعد و ضوابط کے مطابق معرضِ وجود میں آنے والا قانون ساز ادارہ اجتہادِ مطلق کا اختیار رکھتا ہے۔

ان مباحث سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے ایک آزاد اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا۔ اس کے حصول کے لئے تحریک چلائی۔ تحریک کو کامیابی بنانے کے لئے فکری اور انقلابی پیغام تخلیق کیا۔ جس کے نتیجے میں جو اسلامی ریاست قائم ہوئی اس کی قانون ساز اسمبلی کو اجتہادِ مطلق کا اختیار دیا اور اس اجتہاد کے اصول وضع کئے۔ لہٰذا پاکستان کی مقننہ کا یہ اوّلین فرض ہے کہ وہ اپنے محسن، علامہ اقبالؒ کے اصولوں کی روشنی میں اجتہادِ مطلق

کا فریضہ انجام دے۔

پاکستانی قوم کا فرض

پاکستانی قوم کا فرض ہے کہ وہ اپنے رہبر علامہ اقبالؒ کے احسانات کو پہچانے جن کے تصور و فکر کے طفیل انہیں ایک عظیم الشان جدید اسلامی ریاست کے باعزت اور باوقار شہری بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اس نعمت کے شکرانے کے طور پر وہ ایک ایسی قانون ساز اسمبلی تشکیل دیں، جو علامہ کے اجتہادی اصولوں پر پوری اُترے، تاکہ وہ جدید علوم، تجربات اور توانا افکار کی روشنی میں قرآن کے اساسی اور بنیادی اصولوں کی تعبیرِ نو کے ذریعے ایک جدید فقہ مرتب کرے، جو فرقہ وارانہ اختلافات، علاقائی، لسانی اور صوبائی تعصبات اور معاشی اور معاشرتی تضادات کو بہالے جائے اور پاکستان ایک متحدہ جدید جمہوری ریاست کے طور پر اُبھرے جس میں عدل و انصاف کی فراوانی ہو۔ معاشرتی، معاشی اور سیاسی مساوات کے اصولوں کی حکمرانی ہو اور پاکستانی قوم اعتصام بحبل اللہ کی اساس پر بنیان مرصوص کے قرآنی تصور کا عملی نمونہ پیش کرے۔

اقبالؒ کے افکار پر کیوں عمل نہ ہوا؟

اس سوال کا جواب ابھی تشنہ ہے کہ ریاستی امور اور حکومتی معاملات پر علامہ اقبالؒ کے افکار کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟ حالانکہ ان تصورات میں ایسے امور و معاملات پر وسیع مواد موجود ہے۔ اس کے کچھ اسباب تو اس مقالے کی ابتدا میں بیان ہوئے ہیں۔ ایک اور سبب یہ ہوا کہ قبل از تقسیم ہند علامہ اقبالؒ نے برہمنی ذہنیت میں اسلام اور مسلمان کے خلاف پرورش پانے والی عداوت کو اپنی مومنانہ فراست سے بھانپ لیا تھا۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے علیحدہ اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ بعض مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی کھل کر مخالفت کی اور بعض نے خاموش تماشائی کی حیثیت سے دشمن کو تقویت پہنچائی۔ علامہ کے فکر و نظر کی بلوغت اور تاریخی عمل کا زور نظریۂ پاکستان کے موافق تھا۔ اس لئے ان کی مخالفت اور تماشا بینی کے باوجود تحریکِ پاکستان، ریاستِ پاکستان کی شکل اختیار کر گئی۔ اس کا تاریخی، قومی اور سیاسی تقاضا یہ تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد تعمیرِ پاکستان کے عمل میں اس کے آئین کی تدوین، ریاستی اداروں کی تشکیل، معاشرتی و معاشی نظاموں کی ترتیب بھی ان خطوط پر ہوتی جو علامہ اقبالؒ نے اس مقصد کے لئے وضع کئے تھے۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے بلکہ تاریخِ پاکستان کے ساتھ کھلا مذاق ہے کہ جو لوگ تحریکِ پاکستان میں علامہ کے خلاف سیاسی جنگ ہار گئے تھے۔ وہ قیامِ پاکستان کے بعد تعمیرِ پاکستان سے متعلق علامہ کے افکار کو دبانے اور انہیں شکست سے دوچار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح جو مقصد وہ تحریک

پاکستان کے دوران حاصل نہ کر سکے تھے وہ انہوں نے تعمیرِ پاکستان کے دوران حاصل کر لیا۔ انصاف کا ابتدائی اصول ہے کہ کسی کو سنے بغیر سزا نہ دی جائے مگر اقبالؒ کے ساتھ یہ کیسا سلوک ہو رہا ہے کہ ان کے افکار کو آزمائے بغیر انہیں ناکام قرار دیا جائے! پاکستان کے قیام کے جواز پر طعن کیا جائے! کیا اقبالؒ کے تصورِ اخوت کو اداراتی شکل دینے کے بعد، سندھی، بلوچی، پنجابی، پٹھان اور مہاجر کی لڑائی کو قیامِ پاکستان کے مضمرات میں شامل کیا جا رہا ہے؟ کیا اقبالؒ کے اصولِ مساوات کی بنیاد پر جاگیرداری اور سرمایہ داری ختم کر کے اور معاشی و معاشرتی مساواتی نظام قائم کر کے، امارت اور غربت کی موجودہ طبقاتی کشمکش کو کس کے پلے باندھا جا رہا ہے؟ کیا ان کے اصولِ حریت کے مطابق جمہوری طرزِ حکومت قائم کرنے کے بعد آمریت کا نظام ان پر عائد کیا جا رہا ہے؟ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اخوت، مساوات اور حریت کے اصولوں میں سے ایک اصول پر بھی عمل نہیں کیا گیا، بلکہ صاف حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ کی سرزمین پر تو مخالفانہ قبضہ کر لیا گیا اور اس کے اخوت، مساوات اور حریت کے اشعار کو ریڈیائی لہروں کے ذریعے ہوا اور فضا میں تحلیل کر دیا گیا۔ مصورِ پاکستان کی پاک سرزمین تو قبضۂ مخالفانہ میں چلی گئی اور اس کی فضا اقبالؒ کے لئے چھوڑ دی گئی۔ اقبالؒ پاکستان کا مصور ہے تو پاک سرزمین اس کے تصور کا بیج چاہتی ہے۔ کوئی تصور حقیقت کی شکل اختیار نہیں کر سکتا جب تک اُسے اگنے، نشوونما پانے اور پھلنے پھولنے کے لئے زمین میسر نہ ہو۔ مگر یہ اقبالؒ کے ساتھ بے انصافی ہے کہ اس کے تصور کو تو ہوا میں تحلیل کر دیا جائے اور طعن دیا جائے کہ وہ بے برگ و بار ہے۔ پاکستانی قوم کی اپنے محسن کے ساتھ بے وفائی کی یہ بدترین مثال ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدرت نے اس قوم کو فرقہ واریت، صوبائیت، لسانیت، علاقائیت، غربت، جہالت اور بیماری کے دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا۔

اب آخری چارہ کار یہ رہ گیا ہے کہ قوم اپنی بے وفائی کا کفارہ ادا کرے، اپنے محسن سے معافی مانگے جتنا پاکستان باقی رہ گیا ہے اس کے حفظ و بقاء، وحدت و یک جہتی اور تعمیر و تشکیل کے لئے علامہ اقبالؒ نے جو تعمیری، فکری اور تخلیقی مواد جمع کیا تھا اسے استعمال میں لائے۔ علامہ اقبالؒ کے تعمیری مواد میں اتنی قوت اور توانائی موجود ہے کہ شکستہ پاکستان کو بھی ایک متحدہ، مضبوط اور مستحکم جدید اسلامی ریاست میں بدل سکتا ہے۔ علامہ کے عقیدت مندوں کو اس خوف سے اپنے آپ کو آزاد کر لینا چاہیئے جو تحریکِ پاکستان کی شکست خوردہ ذہنیت نے اب دوبارہ پیدا کر رکھا ہے۔ اگر علامہ کے عقیدت مند اسی جذبے اور ولولے سے سرشار ہو کر اٹھ کھڑے ہوں جو ان میں تحریکِ پاکستان کے دوران پیدا ہوا تھا، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ تعمیرِ پاکستان کے اس عمل میں اسی طرح کامیاب ہوں جس طرح وہ تحریکِ پاکستان کے دوران کامیاب ہوئے

تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کے وقت بھی مسلمانوں کو اپنی ہی صفوں سے خطرہ لاحق ہوا تھا اور تعمیرِ پاکستان کے دوران بھی یہ خطرہ جتنا اپنوں نے پیدا کر رکھا ہے اتنا بیگانوں سے نہیں۔ لہٰذا قوم کو ہمت سے کام لے کر علامہ کے افکار کے مطابق پاکستان کو ایک جدید اسلامی ریاست بنانے کے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہونا چاہیئے۔

مُلکی قوانین میں قرآن و سُنّت کی بالادستی

اس موضوع پر دیگر بہت سے مضامین کے علاوہ بریگیڈیئر اعزاز الدین احمد خان صاحب کا انگریزی مضمون جس میں "قرآن و سُنّت" کی جگہ "الدین" کی اصطلاح متعارف کروائی گئی ہے، بھی آپ کو دعوتِ فکر دے رہا ہے۔

سوچیئے!

کیا اس نعرۂ مستانہ کی تان مذہبی، مسلکی، گروہی، فروعی، فقہی اور مشربی مسائل پر ٹوٹے گی یا قرآن سے مراد قرآن اور سنّت سے مراد نفاذِ قرآن ہوگا؟

اخبارات آپ کا نقطۂ نظر جاننے کے لئے بیتاب ہیں۔ طلوعِ اسلام کے صفحات آپ کے رشحاتِ قلم کے لئے حاضر ہیں۔

غور فرمایئے!

کیا ہو رہا ہے؟ ——— کیا ہونے والا ہے؟

ڈاکٹر سید عبدالودود

ملاوٹ

دین میں ملاوٹ کا نیا انداز

دوسری قسط

اجتہاد

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب فرماتے ہیں کہ "اجتہاد کے بارے میں علامہ اقبالؒ کی یہ رائے تو سو فی صد درست ہے کہ اب اجتہاد پارلیمنٹ کے ذریعے ہوگا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اجتہاد کا حق صرف ارکانِ پارلیمنٹ کے لئے مختص ہوگا اور پارلیمنٹ سے باہر کے اصحابِ علم و فضل اور اربابِ فہم و دانش کے لئے شجرِ ممنوعہ ہوگا بلکہ اصل مراد یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی کہ کونسا اجتہاد قانون کا درجہ حاصل کر کے بالفعل نافذ ہوگا تاہم چونکہ اس امر کا فیصلہ کہ آیا اجتہاد حدودِ شریعت کے اندر اندر ہے یا تجاوز کر گیا ہے ایک علمی اور فنی معاملہ ہے۔ لہٰذا عقل و منطق اس کا اختیار ایسی پارلیمنٹ کو نہیں دیا جا سکتا جس کے ارکان محض عمر کے لحاظ سے بالغ مردوں اور عورتوں کے حق رائے دہی کی بنیاد پر منتخب ہوتے ہوں۔ قطع نظر کہ وہ دین و شریعت کے علم سے بے بہرہ ہوں۔"

آپ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کس مخمصے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو خدائے واحد لاشریک کی اطاعت کی بجائے ڈھائی تین صد مجازی خداؤں کی اسمبلی کی اطاعت لازمی سمجھتے ہیں اس لئے کہ علامہ اقبالؒ ایسا فرما گئے ہیں اور دوسری طرف ان ارکانِ اسمبلی کو قابلِ اعتبار بھی نہیں سمجھتے کیونکہ یہ بارس ٹریڈنگ کے ذریعے خریدے ہوئے گدھے گھوڑے اور خچر ہیں۔

اس صورت حال سے بچ نکلنے کے لئے ڈاکٹر صاحب تین راستے وضع کرتے ہیں۔ "(۱) پارلیمنٹ میں وہ لوگ شامل ہوں جو شریعتِ اسلامی کا معتدبہ علم حاصل کر چکے ہوں۔ (۲) پارلیمنٹ سے بالاتر ایک ادارہ ہو جو علماء پر مشتمل ہو۔ (۳) اجتہاد کا اختیار تو پارلیمنٹ ہی کے ہاتھ میں ہو لیکن ایک خاص فنی اور علمی معاملے کو ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے سپرد کر دیا جائے یہ معلوم کرنے کے لئے پارلیمنٹ کا فیصلہ قرآن و سنت کے مطابق ہے کہ نہیں؟"

ظاہر ہے کہ پہلے دونوں راستے تھیاکریسی کی طرف جاتے ہیں اور اسے ڈاکٹر صاحب خود بھی تسلیم کرتے ہیں اور اگر قانون سازی کا انحصار پارلیمنٹ پر رکھنا لازمی ہے تو ان کا تجویز کردہ تیسرا راستہ نسبتاً درست ہے لیکن یہ عارضی ہے۔ بہرحال یہ وقت کٹی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ لیکن اس میں ایک اہم چیز کو مدنظر رکھنا ہوگا کہ فیصلہ عام عدالت کرے، نہ کہ کوئی خاص شرعی عدالت۔ ایک مخصوص طبقہ جن کو علماء کہا جاتا ہے، اس عدالت میں بطور وکیل پیش ہوسکیں گے۔ وہ اپنے اپنے نقطۂ نظر کی وکالت تو کرسکیں گے لیکن وہ جج کا رول ادا نہیں کرسکیں گے۔ فیصلہ صرف عدالت نے دینا ہوگا۔ درحقیقت اس مسئلہ کا مستقل حل دو طریق سے ہوسکے گا۔ اوّل عوام الناس کی تعلیم و تربیت کے ذریعے۔ اصل سوال یہ ہے کہ امت میں یک رنگی اور یک نگی کس طرح پیدا کی جائے۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ یک رنگی پیدا ہوتی ہے افراد کے نفسیاتی تغیر سے، ان کی ذہنیت کی تبدیلی سے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۱۳/۱۱)

کسی قوم کی خارجی دنیا میں تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اس کی داخلی دنیا، اس کے افراد کی نفسیات، ان کی ذہنیت میں تبدیلی نہ آئے۔

قرآنِ کریم نے حضورؐ نبی اکرمؐ کا فریضہ بتایا ہے۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (۶۲/۲) یعنی قرآنی قوانین اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم اور اس طرح افرادِ اُمت کی نشوونما۔ یہ تھا تغیرِ نفس کا پروگرام جسے حضورؐ نے ۱۳ سال تک مکی زندگی میں جاری رکھا یعنی حضورؐ کی عمرِ نبوت (۲۳ سال) میں سے ۶۰ فی صد اسی پروگرام میں صرف ہوگئے۔ اس کے بغیر اسلامی نظام کا قیام مشکل تھا۔ دراصل ایک رسول آتا ہی اس لئے تھا کہ جو دنیا اس کے سامنے ہو اس کی جگہ ایک نئی دنیا تعمیر کردے۔ پاکستان کی صحیح آئیڈیالوجی، قرآن کریم کی صحیح تعلیم اور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے قرآنی تصور کے سوا کچھ نہیں۔ لہٰذا ہمارے نوجوانوں کی صحیح تعلیم کا مقصود بھی اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ ان کے قلب و دماغ کو اسی سانچے میں ڈھالا جائے اور ان میں ایسی صلاحیت پیدا کردی جائے کہ دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے تو وہ فیصلہ کرسکیں کہ اس باب میں قرآن کریم کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ یہ مسئلہ اس طرح حل نہیں ہوتا کہ دینی تعلیم کے لئے مکتب اور دارالعلوم الگ اور دنیاوی تعلیم کے لئے سکول اور کالج الگ۔ دین اور دنیا کی یہ ثنویت یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ نہ ہی اس کا یہ طریق ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں ایک پیریڈ دینیات کا رکھ دیا جائے یا ایم۔اے کے لئے اسلامیات کا الگ مضمون تجویز کردیا جائے۔ ان طریقوں سے طالب علموں کی معلومات میں تو اضافہ ہوسکتا ہے لیکن اس سے وہ مقصد حل نہیں ہوسکتا کہ طالب علم اس قابل ہوجائے کہ دنیا کا ہر دروازہ دین کی چابی سے کھول سکے۔

"از کلیدِ دیں در دنیا کشاد"

اب پھر زیرِ بحث موضوع کی طرف لوٹیے۔ اگر ہم اس پروگرام پر دس پندرہ سال بھی خرچ کردیتے تو آج اسمبلیوں کے

اندر گھوڑوں کی بجائے انسان نظر آتے۔ انسان بھی وہ جو درحقیقت مسلمان ہوں اور مسلمان بھی وہ جو نماز میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ کہتے وقت یہ نہ سمجھیں کہ "اے اللہ! ہم تیری پرستش کرتے ہیں بلکہ یہ سمجھیں کہ "اے اللہ! ہم تیرے ہر حکم کے آگے سرنگوں ہیں"۔

بہرحال اب بھی اگر اللہ کا نام لے کر تعلیمی نظام کو درست سمت دے دی جائے تو چند سالوں کے بعد پاکستانی معاشرت کا نقشہ اللہ کے فضل سے مختلف ہوگا۔ خاص طور پر لاء کالجوں کو فوری طور پر نئے سرے سے ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ آج بھی ہر قانون دان کے لئے کم از کم یہ جاننا لازمی ہے کہ الدّین میں (PERMANENT) غیر متبدّل کیا ہے اور (CHANGEBLE) متبدّل کیا ہے۔

دوسری چیز جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ مملکتِ پاکستان میں FORM OF GOVERNMENT کیا ہونا چاہیئے۔ کیا یہ PARLIMENTARY FORM OF GOVERNMENT حقیقتاً ایسی چیز ہے جو کہ قرآن کی مستقل اقدار، احکام و قوانین کی طرح غیر متبدّل ہے؟ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ فی زمانہ یہ واقعی غیر متبدّل ہے کیونکہ علامہ اقبالؒ اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس موضوع کو میں بعد میں زیرِ بحث لاؤں گا اور بیان کروں گا کہ مروجہ FORMS OF GOVERNMENT میں سے ہر ایک کے فوائد کیا ہیں اور نقصانات کیا ہیں؟ یہ مسئلہ درحقیقت پاکستان کے چوٹی کے صاحبِ دماغ اور قانون دانوں کے بیٹھ کر حل کرنے کا ہے

سیاسی پارٹیاں اور مذہبی فرقہ بندی

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب فرماتے ہیں۔

"عصرِ حاضر کی ترقی یافتہ اور روشن خیال ریاست کا اہم کردار سیاسی جماعتیں بھی ہیں اور انسان کی حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کی طرح جماعت سازی بھی شہریوں کا ایک مسلّم حق سمجھا جاتا ہے۔ عہدِ حاضر کی اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت میں بھی عوام کو یہ حق بعض پابندیوں اور بعض اضافی آزادیوں کے ساتھ حاصل ہوگا۔ پابندی یہ کہ کوئی سیاسی جماعت یا تنظیم اپنے منشور میں ایسی چیز شامل نہ کر سکے گی جو کتاب و سنت کی نصوص کے منافی ہو"

اور مذہبی فرقہ بندی یعنی فقہی اور مسلکی اختلافات کے متعلق ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

"واقعہ یہ ہے کہ کچھ تو اس مسئلہ کی سنگینی واقعتاً اتنی نہیں جتنی کہ بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی حدت و حرارت یا جمود و تعطل کی پیدا کردہ ہے یا مذہبی پیشہ ورانہ

چشمک کا نتیجہ اور یہ دونوں چیزیں اسلامی ریاست کے قیام سے خود بخود ختم ہو جائیں گی عہدِ حاضر کی اسلامی ریاست نیم سیکولر ہو گی..... اس میں پورے پرسنل لا اور احوالِ شخصی (بشمول عائلی قوانین) میں جملہ فقہی مسالک برابر تسلیم کئے جائیں گے۔"

مزید فرمایا کہ

"اس میں کوئی حرج نہیں ہو گا کہ مختلف فقہی مسلک رجسٹر کر لئے جائیں اور ان کے اپنے اپنے اعلیٰ سطحی بورڈ ہوں جو اپنے اپنے مسلک کی مساجد اور اوقاف کا انتظام سنبھال لیں اور حکومت کو اپنے اپنے مسالک کے متعلق مشورے دے سکیں۔ یہاں تک کہ عائلی مقدمات کا فیصلہ بھی ان کے سپرد کر دیا جائے..... ملک کی آبادی کی اکثریت جس فقہ کی پیرو ہو، پبلک لا میں اسی کو نافذ قرار دیا جائے۔"

واہ رے ڈاکٹر صاحب! آپ کے بنا سپتی نظامِ اسلام کا نقشہ دیکھ کر مزا آ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملائی ذہن میں انتشار اس حد تک رچا بسا ہوا ہے کہ وحدتِ اُمت کا تصور سرے سے غائب ہے، یہ اُمتِ مسلمہ کو ریت کے ذروں میں تبدیل کرنے اور بکھیرنے کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ "حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کی طرح جماعت سازی بھی شہریوں کا مسلّم حق ہے۔ اس امر پر پابندی صرف یہ ہو گی کہ کوئی سیاسی جماعت یا تنظیم اپنے منشور میں ایسی چیز شامل نہ کر سکے گی جو کتاب و سنت کے نصوص کے منافی ہو۔" یہ عوام الناس کو اُلو بنانے کا مخصوص حربہ ہے کہ اپنے ہر خود تراشیدہ تصور کے اظہار سے پہلے قرآن و سنت کا نام لکھ دیا جائے۔ جس طرح ہر خط کے شروع میں ۷۸۶ لکھ دیا جاتا ہے اور اس خط کے مضمون کا ۷۸۶ کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ عجب بات ہے کہ قرآن و سنت کے نام سے ایسا نظریہ پیش کیا جائے جو قرآن و سنت کے بنیادی احکام کے خلاف ہو۔ یا تو یہ قرآن سے لاعلمی کا ثبوت ہے یا پھر قرآن کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ از روئے قرآن امتِ مسلمہ میں ہر قسم کی تفریق لعنت ہے۔ مذہبی فرقہ بندی تو صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ یہ اُس وقت شروع ہوئی جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کے اتباع کی جگہ انسانوں کے خود تراشیدہ تصورات و توہمات نے لے لی۔ لیکن سیاسی پارٹی بازی دورِ حاضر کی پیداوار ہے۔ اوّل الذکر بڑی لعنت ہے اور آخر الذکر چھوٹی۔ لیکن ہیں ہر دو ہی لعنت اس چھوٹی لعنت کے تباہ کن نتائج ایک بھیانک شکل میں سب کے سامنے ہیں لیکن مفاد پرست عناصر "ثَمَنًا قَلِيلًا" کے عوض اس کے حق میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب فرماتے ہیں:

"فقہی اور مسلکی اختلافات کی سنگینی واقعتاً اتنی نہیں جتنی کہ بظاہر معلوم ہوتی ہے اسلامی ریاست کے قیام سے خود بخود ختم ہو جائے گی۔"

اور اس سنگینی کو ختم کرنے کا علاج یہ بتایا ہے کہ

"فقہی مسالک رجسٹر کر لئے جائیں گے۔ ان کے اپنے اپنے اعلیٰ سطحی بورڈ ہوں گے جو اپنے اپنے مسلک کی مساجد (ضرار) اور اوقاف کے انتظامات سنبھال لیں گے۔"

اس معرکہ آرا اور بے مثل تحریر پر اور کیا تبصرہ ہو سکتا ہے کہ ــــ بریں عقل و دانش بباید گریست ــــ یعنی ہر فرقے کو اپنے اپنے امام یا ذاتی خدا کی پرستش کی اجازت دے دی جائے گی۔ ہر فرقے میں بھی چونکہ مختلف خیالات کے لوگ موجود ہوتے ہیں، اس لئے اس کے افراد کو بھی ریت کے ذرّوں کی طرح بکھیر دیا جائے گا۔

چنانچہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا خیال ہے کہ پاکستان میں ایک قوم نہیں بستی، یہاں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) اللہ کے قوانین کو حاصل نہیں ہوگا بلکہ ایسے قوانین کو حاصل ہوگا جو مختلف فرقہ بازوں کے خود تراشیدہ ہیں۔ حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم معاشرہ کی بنیاد توحید پر رکھی تھی۔ اللہ ایک، اس کا قانون ایک، جو آخری رسولؐ کی وساطت سے بذریعہ وحی ملا تھا۔ اس کا نتیجہ وحدتِ امت تھی اور امتِ مسلمہ کی مشینری کے ہر جزو میں باہمی موافقت (COORDINATION) تھی۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ "شرک" ہے یعنی ایک خدائے واحد پر ایمان کی بجائے، مختلف خداؤں پر ایمان ہے۔

قرآن کریم اور اُمّت میں فرقہ بندی

ارشاد ہے۔

..... وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ (۱۸/۱۱۰)

"اپنے پروردگار کی محکومیت میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔"

پھر کہا:۔

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (۳۱/۱۳)

"(اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالےٰ کا ہے) تم اس کے اقتدار میں کسی اور کو شریک نہ کرنا بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔"

مختصر الفاظ میں:۔

(i) یہ ایمان رکھنا کہ وہ اختیارات جو اللہ تعالےٰ کے لئے مختص ہیں، وہ کسی اور ہستی کو بھی حاصل ہو سکتے ہیں، شرک ہے۔

(ii) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور شخص یا طاقت کے سامنے جھکنا اور اس کے قوانین کا اتباع کرنا شرک ہے۔

(iii) چنانچہ ایسے قوانین کا اتباع، جو قرآنِ کریم کے قوانین کے خلاف ہوں، شرک ہے۔

(iv) خدائے واحد کے قوانین کے اتباع کا لازمی نتیجہ وحدتِ اُمت ہے۔ اُمت کا فرقوں میں بٹ جانا شرک ہے کیونکہ ہر فرقے کے قریب، قوانین کے اتباع میں، آخری اتھارٹی، اللہ کے بجائے کوئی انسان ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:۔

وَهُوَ الَّذِىْ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِى الْاَرْضِ اِلٰهٌ ...۝ (۴۳/۸۴)

"وہی اللہ ہے جس کا قانون خارجی کائنات میں بھی کارفرما ہے اور انسانی دنیا میں بھی"

پھر کہا:۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ...۝ (۲۱/۲۲)

"اگر کائنات میں خدا کے سوا کوئی اور الٰہ (SOVEREIGN POWERS) بھی ہوں یعنی اس کے ایک گوشے میں خدا کے قوانین نافذ ہوں اور دوسرے گوشوں میں کسی اور کے قوانین تو کائنات کا سلسلہ تہس نہس ہو جائے"

قرآنِ کریم نہ صرف یہ کہ معاشرے میں انسانوں کے خود تراشیدہ قوانین کے نفاذ کو، اللہ پر ایمان کی نفی قرار دیتا ہے بلکہ اس سے آگے جاتا ہے۔ چنانچہ اپنی خواہشات کو خدا بنانے والوں کے متعلق کہتا ہے:۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

(۴۵/۲۳)

"کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے اپنی خواہش کو الٰہ بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے بوجھنے کے گمراہ ہو رہا ہے، تو خدا نے بھی اس کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اب خدا کے سوا اس کو کون راہ پر لا سکتا ہے۔ تو کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے"؛

یہ ہیں قرآنِ کریم کے احکامات، ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے فقہاء، پیروں اور مرشدوں کو الٰہ بنا رکھا ہے اور جس کی وجہ سے یوں پوری اُمتِ مسلمہ فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ قرآن کہتا ہے:۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ...۝ (۳/۱۰۳)

"(یاد رکھو! دین انفرادی مسلک کا نام نہیں، نہ گروہ بندیوں کے طریقہ کا۔ لہٰذا تمہارے لئے

ضروری ہے کہ تم سب کے سب بلا استثناء اجتماعی طور پر اس نظام کے ساتھ محکم طور پر وابستہ رہو اور امت میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کو مت آنے دو۔ فرقہ بندی شرک ہے۔" (۳۲-۳۰/۲۱) اور پارٹی بازی عذاب (۵/۶۵)۔"

قرآن کہتا ہے کہ اے رسولؐ! ان فرقہ پرستوں سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُھُمْ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ یُنَبِّئُھُمْ بِمَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝ (۶/۱۶۰)

"(دین ایک راستے پر چلنے کا نام ہے، مختلف راستوں پر چلنے کا نام نہیں) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور الگ الگ گروہ بن جائیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ قانونِ خداوندی کے سپرد کر دو۔ وہی بتلائے گا کہ ان کی روش کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

یہ دیکھتے جائیے کہ امت کو فرقوں میں بانٹنے والوں کے متعلق قرآن کے کیا احکام ہیں اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نہ صرف یہ کہ ان فرقوں کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ ان کو یہاں تک ڈھیل دی جا رہی ہے کہ وہ اپنے معاملات کو اپنے اپنے فرقے کے قوانین کے تحت سرانجام دے سکتے ہیں۔ گویا ان کو اَنْ لَّا اِلٰہَ چھوڑ کر مختلف خداؤں پر ایمان رکھنے کی چھٹی دی جا رہی ہے۔ ان کو اس بات کی بھی چھٹی ہے کہ کسی مجلس میں بیٹھے نماز کا وقت آ جائے تو اپنی الگ الگ جماعت بنا کر کھڑے ہو جائیں۔

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:۔

مُنِیْبِیْنَ اِلَیْہِ وَ اتَّقُوْہُ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا ؕ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲)

"یہ نظام کیا ہے؟ یہ کہ سفرِ زندگی میں تمہارا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھے جو خدا نے تمہارے لئے تجویز کیا ہے۔ تم اس کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ اس کے لئے نظامِ صلوٰۃ قائم کرو جس میں ہر فرد بطیب خاطر قوانینِ خداوندی کا اتباع کئے چلا جاتا ہے۔ اس اتباع اور اطاعت میں کسی اور کے قانون اور فیصلے کو شامل نہ کرو۔ اس سے خود تمہارے اندر پہلے وحدتِ عمل پیدا ہو جائے گی اور اس کے بعد پوری نوعِ انسانی اپنے اختلافات کو چھوڑ کر اُمتِ واحدہ بن جائے گی (۲/۲۱۳)۔ یہی دین کا مقصود ہے۔ لہٰذا تم بڑی احتیاط برتنا کہ اس

طرح توحید کے پیرو بن کر پھر سے مشرک نہ بن جاؤ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس طرح امتِ واحدہ بننے کی بجائے مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ فرقوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ جس طریق پر ہم چل رہے ہیں، وہی حق و صداقت کا راستہ ہے، اس لئے کہ وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ یاد رکھو! فرقہ پرستی اور گروہ بندی شرک ہے، تم اس شرک کے مرتکب نہ ہو جانا۔" (۴۲/۱۳ ؛ ۳۳/۵۳ ؛ ۶/۱۶ ؛ ۳/۴)۔

(ضمناً اس سے لفظِ صلوٰۃ کا مفہوم بھی واضح ہو گیا۔ یعنی ایسے معاشرہ کا قیام جس کی بنیاد قانونِ خداوندی کا اتباع ہو۔ ہمارے مُلّا نے صلوٰۃ کے قیام کو صرف نماز پڑھنے تک محدود کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نمازِ باجماعت بھی صلوٰۃ کا حصّہ ہے اور بڑا اہم حصّہ، لیکن صلوٰۃ کا مفہوم بڑا وسیع ہے)۔

یہ فرقہ بندی کیوں پیدا ہوتی ہے؟ عقل و شعور کے باوجود، یہ مذہبی رہنما کیوں اُمّت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تلے رہتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ:۔

وَ اٰتَیْنٰهُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۴۵/۱۷)

"جو ضابطہ قوانین انہیں دیا گیا تھا وہ بڑا واضح تھا لیکن انہوں نے اس قسم کا علم (وحی) مل جانے کے بعد محض باہمی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے آپس میں اختلافات پیدا کر لئے۔ (یعنی ان کے اختلاف اور فرقہ بندی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ جو تعلیم انہیں وحی کے ذریعے دی گئی تھی، اس میں کچھ ابہام اور التباس تھا، وہ تو بڑی واضح تھی۔ یہ اختلاف باہمی ضد اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے جذبہ کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے)۔ ان کے ان اختلافات کا فیصلہ دورِ قیامت میں ہوگا۔"

مزید ارشاد ہے:۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ..... وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (۲/۲۱۳)

"ابتدا میں سب لوگ امتِ واحدہ تھے۔ (یعنی ایک ہی طریقے پر تھے۔ پھر آپس میں

اختلاف کرنے لگے) تو ان کی طرف راست روی پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے بھیجے اور ان کے ساتھ کتابِ برحق نازل کی تاکہ جن امور میں وہ لوگ اختلاف کرتے تھے اُن کا اُن میں فیصلہ کر دے اور اس میں اختلاف بھی ان لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی۔ انہوں نے روشن ہدایت پا لینے کے بعد محض آپس کی ضد کی وجہ سے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے تو جس امرِ حق میں وہ اختلاف کرتے تھے، اللہ نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھا دی اور اللہ اپنے قانون کے مطابق راہِ راست دکھا دیتا ہے۔"

اس آیتِ مقدسہ میں کہا گیا ہے کہ یہ فرقہ پرستی کی بیماری قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ پہلے لوگ ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔ پھر جب تمدنی زندگی شروع ہوئی تو باہمی مفاد میں ٹکراؤ شروع ہو گیا اور اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان اختلافات کا مٹانا تنہا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس مقصد کے لئے اللہ نے انبیاءؑ کو اپنی وحی دے کر بھیجا، وہ اختلافی زندگی کے نتائج و عواقب سے لوگوں کو آگاہ کرتے اور امتِ واحدہ بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوشخبری سناتے۔ ہر نبی اپنے ساتھ قوانینِ خداوندی کا ضابطہ (الکتاب) لاتا جو حق پر مبنی ہوتا تاکہ لوگوں میں اختلافی امور کا فیصلہ کرے۔ ہر نبی اس ضابطہ کی رُو سے وحدت پیدا کرتا چلا جاتا لیکن اس کے بعد وہ لوگ جنہیں یہ ضابطہ دیا گیا تھا، باوجود ایسی واضح تعلیم کے باہمی ضد اور مخالفت اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے خیال سے پھر اختلافات شروع کر دیتے، لیکن جو لوگ اس ضابطہ کی صداقت پر یقین رکھتے، انہیں اللہ اپنے قانون کے مطابق اختلافات سے بچنے کی راہ دکھا دیتا۔ یہی وہ طریق ہے جس سے اللہ ہر اس قوم کو جو اختلافات اور فرقہ بندی سے بچنا چاہتی ہے زندگی کی توازن بدوش اور سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے۔

قرآنِ کریم نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے:-

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ (۱۰/۱۹)

"اور سب لوگ پہلے ایک ہی اُمت یعنی ایک ہی ملت پر تھے پھر جدا جدا ہو گئے اور ایک بات جو تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے ہو چکی نہ ہوتی تو جن باتوں میں وہ اختلافات کرتے ہیں، ان میں فیصلہ کر دیا جاتا۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ "اے رسولؐ! تمہاری دعوت جس کی کہ یہ اس قدر مخالفت کرتے ہیں اس کے سوا کیا ہے کہ تم نوعِ انسان کے اختلافات مٹا کر انہیں ایک عالمگیر برادری بنانا چاہتے

ہو اور یہ چیز اس صورت میں ممکن ہے کہ تمام انسان ایک ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اسی کا نام توحید ہے جو شرک کی نقیض ہے، تمہاری یہ دعوت نہ کوئی نئی دعوت ہے اور نہ ہی انہونی بات۔ انفرادی مفاد پرستیاں پہلے بھی اختلافات پیدا کرتی رہی ہیں جس کی وجہ سے پہلے انبیاءؑ کے پیرو ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے تھے، یہ ہو سکتا تھا کہ ہم انہیں پیدا ہی اس طرح کرتے کہ یہ اختلافات نہ کر سکتے، یا اگر اختلافات کرتے تو ہم اپنی قدرت سے ان اختلافات کو زبردستی مٹا دیتے، لیکن ہم نے اس کے لئے ایک اور قاعدہ مقرر کیا جس سے انسانوں کی آزادی سلب نہیں ہوتی تھی، ہم نے وحی کے ذریعے ایسی تعلیم عطا کی جس سے اختلافات مٹ سکتے تھے۔

یہ ہیں وہ فرقہ بندی کے خلاف قرآنِ کریم کے واضح اور دو ٹوک احکام۔ اب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب خود فیصلہ کر لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ احکام کی پیروی پسند کرتے ہیں یا پاکستان میں فرقہ بندی کو مستقل شکل دینے کے لئے بضد ہیں۔

اُمّتِ مسلمہ کے اندر فرقہ وارانہ تقسیم قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ کائناتی قوانین اور وہ قوانین جو انسان کی راہنمائی کے لئے قرآنِ کریم میں دئے گئے ہیں ان کا سب کا منبع ایک ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:۔

وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ وَ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ۝ (۱۶/۵۱-۵۲)

"جس خدا کا حکم کائنات کی حدود فراموش پہنائیوں میں اس نظم و ضبط سے کارفرما ہے، اس خدا نے انسانوں سے کہا ہے کہ وہ اپنی دنیا میں اسی قانون کو رائج کریں، یہ نہ کریں کہ خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار تسلیم کریں لیکن اپنی تمدنی اور عمرانی دنیا میں اقتدار کسی اور کا تسلیم کریں (اور اسے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے تابع رکھیں) انہیں اس حقیقت کا پورا پورا یقین ہونا چاہیئے کہ خارجی کائنات ہو یا انسانوں کی دنیا، سب میں اختیار و اقتدار صرف ایک خدا کو حاصل ہے کسی اور کو نہیں، اسی کے قوانین کا اتباع کرنا چاہیئے اور ان کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈرنا چاہیئے۔"

کائناتی دنیا پر غور کیجئے، جس تنظیم کے اندر باہمی میل جول ہوگا وہاں وحدتِ عمل موجود ہوگی، جس قدر باہمی اتحاد ہوگا اسی قدر کارکردگی مؤثر اور مکمل ہوگی۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب میڈیکل پریکٹیشنر ہیں۔ انسانی جسم کے نظام پر توجہ فرمائیں۔ نظامِ انہضام، نظامِ دورانِ خون، اعصابی نظام، نظامِ تنفس، نظامِ اخراج، انڈوکرائن نظام وغیرہ غرضیکہ ہر ORGAN SYSTEM نے اپنا اپنا منفرد نظام سنبھالا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود تمام سسٹمز میں باہمی

تعاون اور وحدتِ عمل موجود ہے۔ کوئی ایک سسٹم ایک دوسرے سے آزاد ہو کر کام نہیں کر سکتا۔ ان میں سے کوئی ایک اپنا کام بند کر دے تو سارے جسم کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وحدتِ عمل پوری کائنات میں موجود ہے اور یہی وحدتِ عمل قرآنِ کریم انسانی دنیا میں رائج کرنے کا حکم دیتا ہے یعنی وحدتِ عمل بذریعہ تقسیم کار۔ تقسیم کار اور تفرقہ بازی دونوں کے نتائج ایک دوسرے کے الٹ ہیں۔ اوّل الذکر کا نتیجہ ملتِ اسلامیہ کی نشوونما، ارتقا اور عروج ہے۔ آخر الذکر کا نتیجہ تخریب، انتشار اور لازمی زوال ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نظامِ اسلام اور مغربی جمہوریت کو باہمی خلط ملط کرنے کی تگ و دو میں جا بجا منتشر خیالات کا اظہار فرما رہے ہیں۔ کہیں کتاب کے معنی شریعت کر رہے ہیں، کہیں "عورت کو خلافت کے منصب پر فائز نہ کرنے" جیسے فروعی مسائل پر اپنا دوٹوک فیصلہ صادر فرما رہے ہیں، کہیں فرقہ بندی کو نظامِ اسلام کا مستقل جزو بنانے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک بھونڈی سی مشاورت کے بھی قائل ہیں اور اس کے ساتھ اپنے ذاتی فیصلے ٹھونسنے پر بھی مصر ہیں۔ اس سارے انتشار کی وجہ بظاہر یہ نظر آتی ہے کہ آپ اس بات میں تمیز کرنے سے قاصر ہیں کہ نظامِ اسلام میں غیر متبدل کیا چیز ہے اور متبدل کیا ہے؟

(اگلی قسط میں (FORM OF GOVERNMENT) یعنی دستوری خاکہ پر روشنی ڈالی جائے گی)۔

(جاری ہے)

اس قدر خالق نے آدم بھی نہیں پیدا کئے
جس قدر مخلوق نے تخلیق کر ڈالے خدا

(حسنین بخاری)

آصف جلیل
سعودی عرب

امن کی تلاش

اگر کوئی شخص ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے کے کنارے بیٹھا ہوا پیاس کی شکایت کر رہا ہو تو یقیناً سب اسے احمق، بے وقوف اور نکھٹو جیسے خطابات سے نوازیں گے۔ کچھ یہی حال ہمارے ہاں مسلمانوں کی اکثریت کا ہے۔ جس سے بھی ملئے حالات کا رونا روتا ہوا پائیں گے۔ کوئی بڑھتے ہوئے جرائم پہ نوحہ کناں ہے، کسی کو امن و امان کی صورتِ حال پر تشویش ہے اور کوئی روزگار کے حصول میں حائل رکاوٹوں سے نالاں ہے، نہ کسی کو چین ہے نہ سکون۔

بے شمار مسائل سے دوچار یہ وہ قوم ہے جس کی ۹۵٪ آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اور بحیثیت مسلمان ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اپنے مسائل کا حل اللہ تعالیٰ کے پیش کردہ قوانین کی رُو سے کیا جاتا جو قرآنِ کریم میں محفوظ ہیں لیکن یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ ان قوانین کو ہم پڑھتے تو ضرور ہیں، کبھی ثواب حاصل کرنے کے لئے اور کبھی مرنے والوں کی ارواح کو بخشوانے کے لئے، لیکن ان پر غور نہیں کرتے اور اس طرح ان کی افادیت سے بے خبر رہتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ ہے کہ کسی سکول، مدرسے یا کالج سے اور نہ ہی گھر کے ماحول سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ قرآن کریم ایک مکمل نظامِ زندگی پیش کرتا ہے جس میں انسانوں کے تمام سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کا حل موجود ہے۔ اور تو اور ہمارے دانشور اور ماہرین بھی کسی مسئلہ کے حل کی تلاش کے لئے سر جوڑ کر بیٹھیں تو حالت ان کی بھی اس سے مختلف نہیں ہوتی۔ وہ بھی نہیں سوچتے کہ مسئلہ زیرِ غور کا کوئی حل خالقِ کائنات نے بھی بتایا ہوگا۔

دنیا کے تمام مسائل و مشکلات کے دو ہی ممکنہ نتائج ہو سکتے ہیں۔ خوف اور حزن۔ خوف ہزاروں اقسام کا ہو سکتا ہے لیکن چار عوامل ایسے ہیں جو خوف کا باعث بن سکتے ہیں۔ جان، مال، عزت اور حق تلفی۔ خوف عام طور پر وہ فکر اور پریشانی ہے جو انسان کو کل کے بارے میں لاحق رہتی ہے۔ یہ کہ غذا، لباس، رہائش، صحت اور تعلیم جیسی ضروریات کیسے پوری ہوں گی۔

خوف اور حزن کا خاتمہ صرف قرآنِ کریم کے اتباع سے ہی ممکن ہے۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (۲/۳۸)

"جو میری ہدایت کا اتباع کریں گے انہیں نہ خوف ہوگا اور نہ حزن۔"

اکثر سیاستدان اور مذہبی رہنما نفاذِ اسلام کا نعرہ لگاتے رہتے ہیں لیکن نہ تو ان کے ذہن میں اس کا کوئی تصور ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی پروگرام۔ اگر ان کی باتوں سے کوئی خاکہ بنایا جائے تو اس کا تقاضا اتنا ہی ہوتا ہے کہ اسلامی سزائیں نافذ کی جائیں۔ عورت کو گھر میں بند رکھا جائے۔ اس کی گواہی قبول نہ کی جائے۔ ڈھائی فیصد زکوٰۃ لی جائے اور شرعی امور میں ہر شخص اپنی فقہ کے مطابق عمل کرے۔ کوئی بھول کر بھی اس طرف اشارہ نہیں کرتا کہ انسانی ضروریات کیسے پوری کی جائیں گی۔ ہر شہری کو بنیادی سہولتیں کس طرح مہیا کی جائیں گی۔ ان امور کو اقتدار میں آنے کے بعد تک اٹھا رکھا جاتا ہے اور اقتدار میں آنے کے بعد تمام توانائیاں اقتدار کے تحفظ کے لئے صرف ہو جاتی ہیں۔ اس کی تازہ ترین مثال افغانستان کی "اسلامی" حکومت ہے۔

اسلام کو قانوناً نافذ کرنے کا نظریہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ اللہ کے طے کردہ طریقہ کار کے خلاف ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک تو یہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اختیار و ارادہ کو چھیننے کے مترادف ہے۔ (فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ ۚ (۱۸/۲۹)۔ زبردستی مسلمان بنانے سے تو رسول اللہ کو بھی منع کیا گیا تھا۔ (اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۝ (۱۰/۹۹)۔ دوسرا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہے کہ وہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے نفس میں تبدیلی نہیں کرتی ــــ (اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (۱۱/۱۳)۔ اسی لئے تغیرِ نفس کے بغیر کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کی تائید میں رشوت کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ رشوت لینا اور دینا قانوناً جرم ہے۔ نگرانی کے لئے محکمہ انسدادِ رشوت ستانی بھی موجود ہے اور اب تک اس محکمے کی اپنی نگرانی کے لئے بھی کوئی شعبہ وجود میں آچکا ہوگا۔ لیکن کونسا محکمہ ہے جہاں رشوت نہیں چلتی۔ رشوت خور کی سزا چاہے موت ہی کیوں نہ مقرر کر دی جائے، رشوت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اگر حکومت کا کوئی ملازم یہ عہد کر لے کہ وہ کبھی رشوت نہیں لے گا اور وہ اپنے اس عزم پر پختگی سے قائم ہو تو اُسے کوئی بھی رشوت لینے پر مجبور نہیں کر سکتا اور وہ لاکھوں روپوں کی رشوت بھی قبول نہیں کرے گا۔ یہ نتیجہ ہے اس کے نفس میں تبدیلی کا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون جرم کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے نہ کہ چند شاخیں جو دوبارہ پہلے سے بھی گھنی ہو جاتی ہیں۔

قرآنِ کریم کے قوانین پر عمل کرنے سے ایک ایسا معاشرہ تیار ہوتا ہے جس کے تمام افراد مومن ہوتے ہیں۔ مومن کا مادہ ہی امن سے ہے، یعنی خوف کا نقیض۔ مومنین کے معاشرے میں خوف کا وجود ہی مٹ جاتا ہے کیونکہ

ایک مومن نہ کسی کی حق تلفی کرتا ہے نہ کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے نہ مال پر ، نہ کسی کا حق غصب کرتا ہے۔ ایسے انسان قوم کی پگڑی بناتے ہیں۔ ایسے ہی افراد کے ہاتھوں ایک ایسی مملکت وجود میں آتی ہے جس کا مشن لوٹ کھسوٹ کی بجائے لوگوں کی ضروریات پوری کرنا ہوتا ہے۔ جس کا سربراہ معاشرے میں قرآنی علم و عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر شخص ہوتا ہے اور اس کا معیارِ زندگی ایک عام آدمی کے برابر ہوتا ہے۔

جو کوئی پاکستان میں امن کا خواہاں ہے سب سے پہلے وہ یہ دیکھے کہ وہ کس حد تک مومن ہے۔ کہیں لوگوں کو اس سے اپنی جان، مال، عزت یا حقوق کا خطرہ تو نہیں ہے۔ وہ بغور قرآنِ کریم کا مطالعہ کرے اور ان صفات کو اپناتا چلا جائے جو مومن کی ذات کا حصہ ہوتی ہیں۔ پھر اس پیغام کو دوسروں تک پہنچاتا چلا جائے۔ لوگوں کو بتایا جائے کہ ان کی مشکلات کا علاج خالص قرآنی قوانین میں ہے۔ ہر چند کہ یہ عمل مشکل بھی ہے اور صبر طلب بھی لیکن اس کے سوا کوئی مستقل حل ہو نہیں سکتا۔ جو احباب قرآنی فکر سے روشناس ہو چکے ہیں۔ انہیں اکتسابِ رزق کے ساتھ ساتھ اس فکر کو عام کرنے کے لئے بھی وقت نکالنا چاہیئے۔

کرمفرماؤں سے ضروری التماس

مجلہ طلوعِ اسلام کا زرِ شرکت۔ گفٹ سکیم میں معاونت اور نشر و اشاعت کے لئے عطیات

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵۔ بی گلبرگ II۔ لاہور۔ پاکستان۔

کے نام ارسال فرمائیں تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دقت نہ ہو۔

ناظم ادارہ

آفتاب عروج

طویل مضمون سے اخذ اقتباس

وحدتِ ملّت

بعض اخبارات میں یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ کیا ملک میں موجود بہت سی سیاسی جماعتوں کی موجودگی میں کسی ایک سیاسی جماعت کے نقطۂ نظر سے قائم ہونے والی ریاست کو اسلامی ریاست کہا جا سکتا ہے؟ سوال اہم ہے لیکن سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ابتداءً مسلم لیگ منجملہ دیگر سیاسی جماعتوں کے ایک سیاسی جماعت تھی لیکن جب اس نے اپنا نصب العین پاکستان تجویز کیا اور اپنی جدّوجہد کا رُخ اس منزل کی طرف موڑا تو ملّتِ اسلامیہ نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا ذریعہ اس جماعت کو بنا لیا اور حالت "من تو شدی تو من شدی" کی ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۴ء کے بعد جب مسلم لیگ نے نئے عزائم اور تازہ ولولوں کے ساتھ میدانِ عمل میں قدم رکھا تو قائدِ اعظمؒ نے غیر مسلموں سے سیاسی مذاکرات میں ہمیشہ مطالبہ یہی پیش کیا کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔ مطالبۂ پاکستان کا یہ اعجاز تھا کہ اس نے مسلمانوں اور مسلم لیگ کو یک جان بنا دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے جو کچھ کیا، مسلم لیگ کی معرفت اور مسلم لیگ کے نام سے کیا۔ گویا ملّتِ اسلامیہ نے حصولِ پاکستان کے لئے جو جمعیت تیار کی اس کا نام مسلم لیگ رکھا۔ یہ جمعیت پوری ملّت کا مرکزی ادارہ تھا جو حصولِ پاکستان کے بعد مملکتِ پاکستان میں بدل گیا۔ لہٰذا میرے نزدیک اس تصور میں بنیادی طور پر کوئی وزن نہیں کہ پاکستان کا قیام کسی ایک سیاسی جماعت کا کمال ہے۔ پاکستان، تو بقول قائدِ اعظمؒ اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ پاکستان کا مطالبہ قائدِ اعظمؒ کے الفاظ میں، جمہور مسلمانوں کے لئے ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ان کی حفاظت، ان کی نجات اور ان کی تقدیر کا راز اسی میں پوشیدہ تھا۔ مسلمانوں کو یقین تھا کہ یہ آوازِ اقصائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمتِ گذشتہ کو از سرِ نو زندہ کرے گی۔ لہٰذا کسی نقطۂ نظر سے بھی دیکھئے۔ حقیقت یہی ہے کہ پاکستان پوری قوم کی آواز تھی جسے حاصل کرنے کے لئے ہندو کانگرس کے مقابلے میں مسلم لیگ کا نام سیاسی ضرورت کے لئے استعمال کیا گیا جو وحدتِ امّت اتحادِ انسانیت، رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کی بہترین مثال تھی۔

ثریا عندلیب

سرچشمۂ ہدایت

۱۔ قرآن ایسی کتاب ہے جو ہمیں بے یقینی کی ناہموار پگڈنڈیوں سے نکال کر یقین و ایمان کے سیدھے صاف محکم راستے پر لے جاتی ہے۔

۲۔ قرآنِ کریم نے نزولِ قرآن سے پہلے کی تمام گذشتہ اقوام کے نظامہائے باطل کا نتیجہ بیان کیا ہے اور یہ اس لئے کہ اصول یہ دینا مقصود تھا کہ اچھے اور صحیح نظام کا نتیجہ خوشگوار ہوگا اور باطل نظام کا نتیجہ تباہ کُن ہوگا اور یہ نتیجہ اسی دنیا میں سامنے آجائے گا۔

۳۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ زمین اور آسمان جو گردش میں ہیں اس لئے ہیں کہ کسی کا عمل نتیجہ مرتب کئے بغیر نہ رہ جائے۔

۴۔ قرآنِ کریم اپنی ذات میں خود مکتفی ہے۔ اپنے مطلب اور مقصود کو وہ خود واضح کرتا ہے۔ وہ سراج منیر ہے اور سورج دیکھنے کے لئے کسی چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۵۔ قرآن ایک عملی تحریک کا بے مثال ضابطہ ہے اور اس کے زندہ و پائندہ، درخشندہ و تابندہ نتائج اسی وقت مرتب ہوسکتے ہیں جب اس کی حامل قوم اس کے متعین کردہ نظام کے مطابق ہو۔ نہ یہ کہ اس کے حروف و الفاظ کو گھول گھول کر پیا جائے۔ قرآن کا یہی وہ بے محل استعمال (ظلم) ہے جس کا نتیجہ خسران و نقصان کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ خود قرآن کا فیصلہ ہے۔ (۱۷/۸۲)

۶۔ قرآنِ کریم کی برکت اس پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ جھاڑ پھونک، گنڈا تعویذ سے برکت حاصل کرنے کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں۔ یہ سب عجمی اثرات کا نتیجہ ہے۔

۷۔ قرآنِ حکیم سے راہ نمائی لینی چاہیئے اور اسے پیش کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ابھرتے ہوئے تقاضوں سے واقف ہو اور انسانی علم جس سطح تک جا پہنچا ہے وہ بھی اس کی نگاہوں کے سامنے ہو۔ اگر کوئی شخص

ان مبادیات سے کماحقہٗ باخبر نہیں تو وہ اپنے دور کے لئے قرآن سے راہ نمائی حاصل نہیں کر سکتا۔

۸۔ قرآنِ کریم اسلام کا ضابطۂ قوانین ہے۔ دین اس کے اندر مکمل و محفوظ کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اسلامی تصورات وہ ہیں جن کی سند قرآنِ کریم سے مل جائے۔

۹۔ قرآن کی رُو سے "اخلاقیات" سے مقصد اتنا ہی نہیں کہ ان کے مطابق معاشرہ قائم کیا جائے تو امن و سلامتی کی زندگی بسر ہو جاتی ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے سے فرد کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

۱۰۔ قرآن 'طلسماتِ فلاطونی' کے خلاف ضربِ کلیمی اور عجمی بت کدوں کے حق میں 'تیشۂ ابراہیمی' ہے۔ اس نے ان تمام تخریبی تصوراتِ حیات کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا، جو انسانیت کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل تھے۔

۱۱۔ قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ جو لوگ ضد اور تعصب یا تقلید اور جہالت کی بنا پر سمجھنے سوچنے سے کام نہیں لیتے تو کچھ عرصہ کے بعد ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔

۱۲۔ قرآن کی رُو سے وحی پر ایمان علم و عقل کی رُو سے ہی لایا جا سکتا ہے۔ خواہ یہ نظری دلائل سے ہو اور خواہ وحی کے متعین کردہ نظام کے نتائج کو اپنے سامنے مشہود دیکھ کر۔ ہر حال میں ایمان کی عمارت علم و بصیرت اور عقل و فکر کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔

۱۳۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ جس طرح خدا کی عظمت و ہیبت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کائناتی مظاہر پر غور و فکر کریں۔ اسی طرح قرآن کے حقیقتِ ثابتہ ہونے کا یقین وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خارجی کائنات اور دنیائے انسانیت میں غور و فکر کریں۔

۱۴۔ جو قومیں تسخیرِ فطرت تو کرتی ہیں لیکن قرآن کی مستقل اقدار کا اتباع نہیں کرتیں وہ صرف مقامِ آدمیت تک پہنچتی ہیں، مومن اور متقی کے مقام تک نہیں پہنچتیں۔

۱۵۔ قرآنِ کریم نے مستقل اقدار کو اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ ان صفاتِ خداوندی کو بطور معیار سامنے رکھ کر اپنے اندر انسانی ممکنات کو مشہود کئے جانا مقصودِ دین اور مطلوبِ حیات ہے۔

۱۶۔ قرآن کا فرمان ہے کہ خدا نے کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا۔ اس نے اس کو بالحق پیدا کیا ہے۔ اس کا وجود فریب اور دھوکا نہیں، یہ فی الحقیقت موجود ہے اور ایک مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ جو شخص کائنات کو باطل قرار دیتا ہے وہ قرآن کی رُو سے مومن نہیں کافر ہے۔

۱۷۔ قرآن نے خدا کا جو تصور دیا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات میں خدا کا قانون کارفرما ہے اور اس قانون میں وہ کبھی استثنا

نہیں کرتا، نہ ہی اس میں تغیر و تبدل کرتا ہے۔ اس نے ہر عمل کا ایک نتیجہ مقرر کر دیا ہے اور اس کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا ہے کہ وہ عمل متعینہ نتیجہ پیدا کر کے رہے۔

۱۸۔ قرآنِ کریم زمین کی شخصی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک زمین رزق حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس کی تقسیم لوگوں کی محنت اور ضرورت کے اعتبار سے ہونی چاہیئے اور اس کا نظم و نسق اس جماعت کے ہاتھ میں ہو جو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لئے متمکن ہو۔

۱۹۔ قرآنِ کریم میں جو تشریعی احکام مذکور ہیں وہ کسی خاص قوم کے حالاتِ خاص کو سامنے رکھ کر وضع نہیں کئے گئے، بلکہ وہ عالمگیر ہیں کیونکہ قرآن تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک کے لئے نازل کیا گیا ہے۔

۲۰۔ قرآنِ کریم ہمیں کھلے کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ انسان کی پوزیشن اس کائنات میں ایک مخدوم کی ہے اور جملہ موجوداتِ عالم اس کے خدمت گزار اور مطیع ہیں۔ لہٰذا انسان کا منصب یہ ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے کو اپنا تابع فرمان بنائے۔

سیلاب

کی تباہ کاریوں نے اس وقت تقریباً سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور متاثرہ لوگ بے کسی اور بے بسی کے عالم میں ہم سب کی طرف نظریں اٹھائے مدد کے منتظر ہیں۔ اپنے بہن بھائیوں اور بچوں کی مدد کے لئے دل کھول کر حصہ لیں۔

قارئین اپنی رقوم چیک/ڈرافٹ کی صورت میں ادارہ طلوعِ اسلام کے نام بھی بھجوا سکتے ہیں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

محمد ارشاد۔ مری

قانون سازی میں قرآن پر اتفاق رائے

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن یہاں مختلف ازموں کو آزمانے کا شغل جاری ہو گیا اور تجرباتی ازموں کی ناکامی کے بعد اب کہیں جا کر قوم کا شعوری قبلہ درست ہو جانے کے قابل ہو سکا ہے جس میں عالمی تناظر کے وہ عوامل بھی شامل ہیں جنہوں نے ملوکیت اور اشتراکیت کو فیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

مرحوم صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کے دَور میں ایک شریعت بل سینٹ نے منظور کر لیا تھا لیکن قومی اسمبلی نے نامنظور کر دیا تھا۔ پھر ایک اور شریعت بل لایا گیا جسے کوئی خاص پذیرائی یا انقلاب کی انگڑائی لینے کے قابل نہ سمجھا گیا اور حالات شاہد ہیں کہ موجودہ شریعت بل میں وہ انقلابی سپرٹ نہیں ہے جو قوم کے مُردہ رگ و پے میں انقلابی خون دوڑا سکے۔

قائداعظمؒ نے فرمایا تھا:۔

"اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔"

(خطاب عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے طلبائے سے فروری ۴۲ء)

(II) "میرا اس حقیقت پر ایمان ہے کہ اس کتابِ عظیم میں دنیا اور آخرت کی زندگیوں کے متعلق مکمل ضابطے اور آئین موجود ہیں۔ تمدنی، معاشی اور اخلاقی، امنٹ اور دائمی قواعد موجود ہیں۔

عسکری تنظیم اور مملکت کے داخلی اور خارجی استحکام کے اٹمٹ قوانین موجود ہیں۔ لوگوں کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کے ابدی قواعد موجود ہیں۔ لیکن یہ قواعد اور ضوابط بالعموم اصولی حیثیت سے دیئے گئے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن ان پر عمل پیرا اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق ہوا جائے گا۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے قواعد و ضوابط مرتب اور نافذ کرے۔" (بیان مولانا غلام مرشد خطیب بادشاہی مسجد لاہور ۴/۶/۷۹)

(III) "اگر خدا نے تحریکِ پاکستان کو کامیابی عطا فرمائی، تو اس سرزمین پر حضور خاتم النبیینؐ کی طرز پر حکومت ہوگی جس کا نام خلافت علیٰ منہاجِ نبوت ہوگا۔ بالفاظِ دیگر اس حکومت کے ہر دائرے میں قرآنِ حکیم کی حکمرانی ہوگی۔" (ایضاً)

۲۔ اب عالمِ اسلام کے کچھ نامور محققین و مفکرین کی آراء پر مبنی کتاب "PRINCIPLES OF LAW MAKING IN ISLAM" پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ ان محققین و مفکرین نے بھی اپنے اپنے خطاب میں قرآن کو دستورِ مملکت بنانے کی رائے دی ہے۔ ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں،

۱۔ ڈاکٹر صبحی محمصانی — بیروت
۲۔ پروفیسر تیمور — ترکی
۳۔ پروفیسر مجید خضری جان ہاپکنس ——— یونیورسٹی امریکہ
۴۔ جی۔ اے۔ پرویز — پاکستان
۵۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (جن کے خیالات کو جی۔ اے۔ پرویزؒ نے اپنے خطاب میں سمو دیا ہے)۔

۳۔ بدقسمتی سے پاکستان مختلف فرقوں کے نظریات میں بٹا ہوا ہے۔ اور تو اور خود مودودی مرحوم کو یہاں تک کہنا پڑا کہ "کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہل حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔" (ایشیا، ۲۳ اگست ۷۰ء)

لیکن صرف قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جو حنفیوں، شیعوں اور اہل حدیث وغیرہ کے ہاں مشترک علیہ ہے۔ بقول اقبالؒ۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن — نیست ممکن جز بقرآن زیستن

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان میں قرآن کو دستورِ مملکت قرار دیا جائے۔ تاکہ ملی و شعوری وحدت اجاگر ہو اور قوم میں قرآنی انقلاب انگڑائی لینے کے قابل ہو سکے۔

قرآنی حوالے سے:

۱۔ زمین اللہ کی ہوگی اور مملکت اُسے صرف ان محنت کشوں کے حوالے کرے گی جو محنت کر کے غلّہ پیدا کریں گے۔ انہیں مترفین کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ امیر اور غریب کی موجودہ تفریق انفاقِ مال در رزق کے قرآنی جذبے سے ختم ہوگی۔

۳۔ سودی نظام کے خاتمے کا خواب اس وقت شرمندۂ تعبیر ہوگا جب قوم خود بھی سود کھانا چھوڑ دے گی۔ لوگ بنکوں میں اپنی رقوم بطور امانت رکھیں، نہ کہ برائے منافع۔ سود لینا اور دینا ایک ساتھ ختم کیا جائے۔ یہی قرآن کا منشاء ہے۔

۴۔ علم حاصل کرنا فرض قرار دیا جائے اور نابالغ بچوں کی مشقت پر پابندی عائد کر دی جائے تاکہ تمام نسل تعلیم حاصل کر سکے۔

بہرحال قرآن کے نافذ ہو جانے کے بعد ہمارا قانون سازی کا قبلہ درست ہو جائے گا۔ تمام فرقے قرآنی قوانین کو قبول کریں گے اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق جدید قانون سازی میں ماضی قریب اور ماضی بعید کے تمام قانونی نظائر مثلاً احادیث، فقہ اور اسلامی ممالک کی قانونی کاوشوں کو بھی سامنے رکھا جائے۔ یعنی قرآن پر اتفاقِ رائے پہلے اور جزئی قوانین سازی بعد میں۔

جو کھانا تم کو ناپسند ہو، وہ غریب کو نہ کھلاؤ — حدیثِ نبویؐ

باتیں آصف جاوید کی

آصف جاوید صاحب کے ایک نسبتاً طویل مضمون سے اقتباسات

کیلے کا چھلکا راستے میں نہیں پھینکنا چاہیئے۔ یہ ایک ہدایت ہے۔
مگر کب پتا چلا؟
جب خود پھسلے (تجربہ) جب کسی کو پھسلتے دیکھا۔ (مشاہدہ)
جب کسی کو پھسلتے سُنا۔ (تاریخ)
ہدایت کا چوتھا اور آخری ذریعہ وحیٔ خداوندی ہے جس کی خوبصورتی یہ ہے کہ اُسے پانے کے لئے پھسلنا نہیں پڑتا۔

قرآن ہدایت ہے

کابل گئے۔ مغل بن آئے۔ لگے فارسی الاپنے۔
آب آب کہتے مر گئے۔ پانی کی بوند نصیب نہ ہوئی۔
بیوی پاس تھی۔ آسمان سے تارے توڑ لانے کے لئے تیار۔
پانی موجود۔ مگر دم توڑتے خاوند کے حلق میں قطرہ پانی کا نہ ٹپکا سکی کہ آب کا مطلب نہ جانتی تھی۔

قرآن سمجھ کر پڑھیں

حیوانات کی پہچان ان کی جائے پیدائش ہے۔ چمڑی ہے یا آواز
انسانوں کی شناخت بھی یہی ہو تو
فرق کیا ہوا دونوں میں؟

تتفکرون

حقائق و عبر

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے

روزنامہ جنگ، لاہور اپنی ۲۸ اگست کی اشاعت میں صفحہ اوّل پر رقمطراز ہے:-

"لاہور (نیوز رپورٹر) گورنر پنجاب میاں محمد اظہر نے گذشتہ روز جامعہ المنظور الاسلامیہ کی تقریب کے بعد چائے کی میز پر اپنے مخصوص پنجابی سٹائل میں سچّی اور کھری کھری باتیں کیں اس موقع پر جیّد علماء کرام بھی موجود تھے۔ علماء خاموشی سے گورنر پنجاب کی گفتگو سنتے رہے۔ علمائے کرام سے ان کی مکالمہ بازی بھی ہوئی۔ تفصیلات کے مطابق تقریب کے بعد جب گورنر پنجاب چائے کی میز پر جانے لگے تو ان کے ساتھ آٹھ دس علماء کرام بھی چل پڑے اور انہوں نے مدرسوں کے لئے گرانٹ کا مطالبہ کیا، گورنر پنجاب نے وہاں پر موجود تمام افراد کو بٹھا لیا اور کہا کہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں، ان مدرسوں سے آپ لوگ ملّا پیدا کر رہے ہیں، اسے چندے کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے اور اس کی زندگی مسجد اور حجرے تک ہی محدود ہو کر رہ جاتی ہے، اس سے تو بہتر ہے کہ آپ اسے کیمپ جیل بھیجدیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بیوی اور بچّوں کی زندگی بھی محدود کر دی جاتی ہے۔ اگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ باہر نکلتا ہے تو آپ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی اپنی بیوی کو لے کر باہر پھر رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ ایک معصوم بچّے کے ہاتھ میں لوٹا پکڑا دیتے ہیں اور اس کی شلوار ٹخنوں سے اوپر کرا کر اس کے دروازے دیگر علوم کے لئے بند کرا دیتے ہیں۔ یہ انصاف نہیں، ظلم ہے۔"

طلوعِ اسلام اپنے مخصوص پنجابی انداز میں علماء کرام کے ساتھ اس قدر سچّی اور کھری کھری باتیں کہنے پر ہم گورنر پنجاب میاں محمد اظہر صاحب کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ طالب علموں کا طبقہ کسی ملک اور قوم کا طغرہ (CREST) ہوتا ہے جس سے وہ قوم پہچانی جاتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قوموں کی تقدیر ہمیشہ اُبھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ان نوجوانوں کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں، ان کے گرم خون کی حرارتیں، ان کا زورِ بازو، ان کا جوشِ کردار ایک کف بداماں سیلاب کی طرح اُٹھتا ہے اور ہر ٹکرانے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ قوموں کی تخلیق ان کے نوجوانوں کے کوہ شکن ارادوں کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ اس لئے یہی طبقہ تھا جسے طلوعِ اسلام نے اپنے تصورات کی آماجگاہ، اپنی امیدوں کا مرکز، اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی کو اپنے پیغاماتِ انقلاب آفریں کا درخورِ تخاطب سمجھا اور انہی کے لئے عصرِ حاضر کے مفکر پرویزؒ صاحب اقبالؒ ہی کے الفاظ میں دعا مانگتے ہیں کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے   پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے   مرا نورِ بصیرت عام کر دے

طلوعِ اسلام پاکستان کے اندر پچھلے چالیس برس سے مسلسل مرض کی نشاندہی کرتا چلا آرہا ہے کہ ان بے چاروں کی صحیح تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔ کیونکہ آپ جس قسم کی قوم بنانا چاہیں اس قوم کے بچوں کو اس قسم کی تعلیم دیتے جائیے۔ تعلیم بدل جانے سے نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور زاویۂ نگاہ بدلنے سے اشیاء کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ جب اقدار بدل جائیں، تو دنیا کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ ایسی تعلیم کے لئے طلوعِ اسلام نے یہ حل پیش کیا کہ پاکستان کے اندر ایسی درسگاہیں قائم کی جائیں جن کی تعلیم کا محور خدا کی کتاب یعنی قرآنِ حکیم ہو اور یہ درسگاہیں ایسے طالب علم تیار کریں کہ:

۱۔ پاکستان میں وقتاً فوقتاً جو مسائل سامنے آئیں وہ بتا سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا رہنمائی دیتا ہے۔
۲۔ اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے۔
۳۔ افراد کی زندگی اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہو سکتا ہے۔
۴۔ وہ کونسی ایسی عملی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے یا اس کا کوئی قدم غلط سمت کی طرف اُٹھ گیا ہے۔
۵۔ دنیا کی مختلف قومیں اس وقت جن معاشی، معاشرتی، سیاسی، قومی، بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش حل انہیں نہیں ملتا جس کی وجہ امنِ عالم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے۔ قرآنِ حکیم ان مسائل کا حل کیا تجویز کرتا ہے۔
۶۔ اس درسگاہ کے فارغ التحصیل طالب علم ایسی قابلیت کے مالک ہوں کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں قرآنی نقطۂ نگاہ نہایت وضاحت سے پیش کر سکیں اور اپنے ملک میں بھی دوسروں کی رہنمائی کر سکیں۔

۷۔ ذہنی قابلیت کے علاوہ ان کا کیریکٹر بھی اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ وہ دوسرے نوجوانوں کے لئے قابلِ تقلید مثال پیش کر سکیں اور اس طرح اس حقیقت کی زندہ شہادت بن سکیں کہ جب انسانی قلب و دماغ قرآن کے قالب کے اندر ڈھل جائیں اور وہ سیرتِ نبیٔ اکرمؐ کو اپنے سامنے بطور اُسوۂ حسنہ رکھیں تو اس سے کس طرح ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں جن پر انسانیت فخر کر سکے۔

طلوعِ اسلام نے جو فکر پیش کی ہے اس کے متعلق پاکستان کے ممتاز قانون دان اور سابق وحدتِ مغربی پاکستان کے چیف جسٹس جناب اے۔ آر۔ کیانی (مرحوم) نے ۱۹۶۱ء کے زرعی یونیورسٹی لائل پور کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر فرمایا:۔

"تعلیمی درس گاہوں کے پیشِ نظر یہی نہیں ہونا چاہیئے کہ طالب علم ایک معیّنہ مدت کے بعد صرف اسناد ہی لے کر فارغ ہوں بلکہ وہ اسناد کے ساتھ ان درس گاہوں سے انسان بن کر بھی نکلیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ طلباء ان درس گاہوں سے انسان بن کر نکلیں تو ان درسگاہوں کے اندر آپ کو لامحالہ اس فکر کو اپنانا ہوگا جو طلوعِ اسلام نے پیش کی ہے۔"

طلوعِ اسلام اب بھی مایوس نہیں۔ وہ اپنے نوجوانوں میں زندگی کی جھلک اب بھی دیکھتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

نہیں ہے نا اُمید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ ملّت کی کشتِ ویراں کا نم اُس آبِ نشاط انگیز سے حاصل ہوتا ہے جسے قرآن کہتے ہیں۔ قرآن کے مقرر کردہ حدود و قیود ہی وہ پختہ ساحل ہیں جو حیاتِ انسانی کی جوئے رواں کا رُخ متعیّن کرتے ہیں۔ لیکن انسانی دنیا کے اندر یہ انقلاب صحیح تعلیم کی رُو سے لایا جا سکتا ہے۔ اس لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان بچوں کی صحیح تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔ ان کی گزرگاہوں کو وہ ساحل مہیا کر دیئے جائیں جن کی بنیاد ان قوانین پر ہو جو قرآنِ حکیم کی دفتین میں موجود ہے جنہیں کہیں باہر سے IMPORT کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے ملک و قوم کی یہ عظیم متاع محفوظ ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو مجوّزہ تعلیمی درس گاہیں ایسی درس گاہیں بن جائیں گی جو ان درسگاہوں سے مختلف ہوں گی جن کے متعلق اکبرؔ نے کہا تھا ؎

افسوس کہ فرعون کو "مکتب" کی نہ سُوجھی

شیطان سے انٹرویو

خدائی پارلیمنٹ کے حزبِ اختلاف کے لیڈر مسٹر شیطان کو کون نہیں جانتا۔ دورِ جدید میں قرآنِ پاک اور اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کے سبب شیطان کے فریب میں پھنسنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ خصوصاً ہماری نئی جنریشن شیطان کے دامِ فریب میں بُری طرح جکڑی ہوئی ہے۔ اس لئے میں نے نئی جنریشن کو مسٹر شیطان کے حالات اور نظریات سے شیطان کی زبانی ہی واقف کرانے کے لئے قرآن پاک اور اسلامی کتب کی امداد سے عالمِ خیال میں ایک انٹرویو لیا تاکہ ہماری نئی جنریشن شیطانی چالوں اور شیطانی راز سے واقف ہو سکے اور اس کی چالوں سے بچے اور اس کی راہ پر چلنے سے گریز کرے۔

سوال: انسان کی فضیلت کو غلط ثابت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کو آپ نے چیلنج بھی تو کیا؟

جواب: ہاں، میں نے کہا "اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا۔ آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔"

سوال: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کا یہ چیلنج قبول کر لیا؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے میرا چیلنج قبول کرتے ہوئے فرمایا "میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا" اور یہ حقیقت ہے کہ میرا زور تو انہی لوگوں پر چلتا ہے جو مجھے اپنا سرپرست بناتے اور میرے بہکاوے سے ترک کرتے ہیں۔

سوال: آپ نے سب سے پہلے کسے اپنے دامِ فریب میں گرفتار کیا؟

جواب: عام طور پر یہ مشہور ہے کہ میں نے حضرت حوا کو سب سے پہلے اپنے دامِ فریب میں گرفتار کیا اور پھر انہیں حضرت آدم علیہ السلام کو پھانسنے کے لئے آلۂ کار بنایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان دونوں کو اس درخت کی ترغیب دے کر اللہ تعالیٰ کی پیروی سے ہٹایا اور انہیں اس حالت سے نکال کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔

(ماہنامہ سبیل ہدایت ص۹ اگست ۹۲ء)

طلوعِ اسلام شیطان نے چیلنج دیا۔ اللہ نے یہ کہہ کر چیلنج قبول کر لیا کہ "میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا" شیطان کا دعویٰ ہے کہ اس نے (کسی عام آدمی کو نہیں) آدم علیہ السلام اور اس کی بیوی کو اللہ تعالیٰ سے ہٹا لیا۔

بات کیا ہوئی۔ شیطان جیت گیا یا یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں میں سے نہ تھے؟

ایک روزہ سب کنونشن

بزم $\frac{215}{EB}$ اپنے طور پر ایک روزہ سب کنونشن منعقد کر رہی ہے

پروگرام

۱۵ اکتوبر ۱۹۹۲ء

قبل دوپہر آمد احباب۔
ایک بجے دوپہر۔ کھانا۔
۲½ بجے بعد دوپہر۔ استقبالیہ و تعارفی اجلاس
۵ بجے شام۔ چائے۔
۸ بجے رات۔ احباب سے درخواست کی جائے گی کہ وہ فکرِ قرآنی کو آگے بڑھانے کے لئے تجاویز پیش کریں۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۲ء

۹ بجے صبح۔ درسِ قرآن
۱۰ بجے صبح۔ رابطۂ باہمی
۱ بجے دوپہر۔ کھانا اور اس کے بعد الوداع

جو احباب سب کنونشن مذکور میں شریک ہونا چاہیں ان سے درخواست ہے کہ وہ اپنی شمولیت کی اطلاع ۱۰ اکتوبر تک نمائندۂ بزم چک $\frac{215}{EB}$ کو فرما دیں۔ بستر ہمراہ لانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ ایڈریس نوٹ فرمالیں۔

چک EB/۲۱۵، براستہ گگو۔ تحصیل بورے والا ضلع وہاڑی۔

نقد و نظر

۱۔ نام کتاب : جنگِ خلیج کی تباہ کاریاں اور عالمِ اسلام کا مستقبل۔
مؤلف : محمد اشرف ظفر۔
ضخامت : ۴۷۸ صفحات۔
قیمت : سٹوڈنٹ ایڈیشن -/۸۰ روپے، لائبریری ایڈیشن -/۱۳۰ روپے۔
ملنے کا پتہ : ۴۶۴/III-C ٹاؤن شپ؛ محمد ظفر ۱۸/۱۶ نبی پورہ، لال پل، مغلپورہ۔ لاہور

○

خلیجی جنگ کے اسباب و علل اور عواقب و عوامل پر ملک کی نامور ادبی اور سیاسی شخصیات نے اندرونِ ملک شائع ہونے والے جرائد میں جو کچھ بھی لکھا، مؤلف نے کمال عرق ریزی سے اسے یکجا کر دیا ہے، جو مستقبل کے مؤرخین کے لئے جامِ جہاں نما کا کام دے گی، تاہم فہرست مضامین پر نگاہ ڈالیں، تو اس میں کچھ موضوعات ایسے بھی نظر آتے ہیں جن کا نفسِ مضمون سے بظاہر کوئی تعلق نہیں۔

معاملہ اگرچہ بین الاقوامی نوعیت کا ہے لیکن حیرت ہے کہ مؤلف نے اپنی اس ضخیم کتاب میں نہ تو فریقین میں سے کسی ایک کا نقطۂ نظر بیان کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے اور نہ ہی اقوامِ متحدہ کی کسی قرارداد کا عکس شاملِ اشاعت کیا ہے جس سے کتاب کا مجموعی تاثر بین الاقوامی مسئلہ پر مقامی ردِ عمل کا سا ہو کر رہ گیا ہے۔

۴۷۸ صفحات پر مشتمل یہ خوبصورت کتاب جسے رنگین سرِ ورق اور دیدہ زیب طباعت نے اور بھی جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔ قارئینِ طلوعِ اسلام کے لئے بطور ریفرنس بک، مفید ہو سکتی ہے۔

○

۲۔ نام کتاب : کُنْ فَیَکُوْن
مصنف : محمد علی صابر صدیقی۔

ناشر : شیر افضل خان، رکن طلوعِ اسلام ٹرسٹ۔
ضخامت : ۴۸۰ صفحات۔
قیمت : سٹوڈنٹ ایڈیشن ۱۲۰/۰ روپے، لائبریری ایڈیشن ۱۵۰/۰ روپے۔
ملنے کا پتہ : ادارہ فکرِ قرآن، ۳۔بی، یونیورسٹی ٹاؤن، پشاور،
ادارہ طلوعِ اسلام، ۲۵۔بی، گلبرگ II ۔لاہور۔

انسان میں خدا تعالیٰ نے تلاش و جستجو کا جذبہ ودیعت فرمایا ہے، جس کی مدد سے وہ ہر وقت کائنات کے راز معلوم کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ بنی نوعِ انسان نے مختلف ادوار میں اپنی سمجھ بوجھ اور علم کے مطابق تخلیقِ کائنات کے متعلق کچھ نہ کچھ نظریات قائم کئے ہیں۔ اس کتاب میں ان نظریات کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جدید علمی اور سائنسی تحقیقات سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، انہیں نسبتاً تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناقدین کے مطابق کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کوشش ہے۔ کتاب میں سائنسی حقائق کی خشکی کو ادبی چاشنی سے تروتازگی اور حلاوت بخشی گئی ہے۔ اس میں تغزل کی رمق بھی ہے اور دھیما دھیما طنز و مزاح بھی، سائنسی حقائق بھی ہیں اور قرآنی بصیرت بھی۔ بات نیوٹن کی طبیعیات کی ہو یا آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت کی، مصنف کی نگاہیں اقبال اور قرآن پر جمی رہتی ہیں۔

مصنف پاکستانی فضائیہ کے شعبۂ تعلیم سے منسلک رہے ہیں۔ آجکل وہ پشاور صدر میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی کتاب ابلیس و آدم قارئینِ طلوعِ اسلام میں بے مثال شرفِ قبولیت حاصل کر چکی ہے۔

استحکامِ ذات

کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ سے آگے بڑھ کر نوعِ انسانی کے مفادِ کلّی اور عالمگیر ربوبیت کا انتظام کرے۔

علی محمد چدھڑ

مغفرت

قرآن سمجھنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا تھا اُس وقت عرب لوگ عربی الفاظ کو کونسے معانی میں استعمال کرتے تھے۔ مثلاً آپ ایک مشہور قرآنی اصطلاح 'مغفرت' کو ہی لے لیں۔ اس کا مادہ غ ر ف ہے۔ غفر میں چھپانے اور محفوظ رکھنے کا مفہوم شامل ہے۔ قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ حُسنِ عمل سے انسان کے اندر وہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ تخریبی قوتوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ اگر کسی قوم یا فرد سے خدا کے کسی قانون کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے، تو اس کے تباہ کن نتائج سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ وہ خدا کے اُس قانون کی اطاعت جس کے نتائج تعمیری اور نفع بخش ہوں اور شد و مد سے کرے۔ اس قانون کے تعمیری نتائج سابقہ لغزش کے تخریبی نتائج سے حفاظت (مغفرت) کا سامان بہم پہنچا دیں گے۔ مغفر اُس خَود کو کہتے ہیں جسے سپاہی سر کی حفاظت کے لئے میدانِ جنگ میں پہنتے ہیں۔ اگر ہم اِسے مرض کی مثال کی رُو سے سمجھنا چاہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ 'مغفرت' اس حفاظتی تدبیر (PREVENTIVE) کا نام ہے جو کسی مرض کے نقصان رساں اثرات سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس طریقۂ کار کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اگر تعمیری نتائج مرتب کرنے والی تدابیر زیادہ مؤثر ہوں گی تو وہ تخریبی نتائج پیدا کرنے والے عناصر پر غالب آجائیں گے۔ اِسے قرآن نے یوں بیان کیا ہے کہ "یاد رکھو حُسن پیدا کرنے والے اعمال بگاڑ پیدا کرنے والی تدابیر کے اثرات کا ازالہ کر دیتے ہیں۔" (۱۱/۱۱۴)

لیکن بعد ازاں جب عربی زبان عجمی تصورات کے اظہار کا ذریعہ بنی تو عربی الفاظ کا اپنا حقیقی مفہوم بھی بدل گیا، اور مغفرت کو گناہوں کی بخشش کے معنوں میں لیا جانے لگا۔ جیسے ایک مجرم قانون کی رُو سے سزا کا مستحق قرار پا چکا ہے۔ جب وہ روتا ہے، گڑگڑا کر دعاؤں میں معافیاں مانگتا ہے، تو خدا اس پر ترس کھا کر معاف فرما دیتا ہے اور جتنے بھی جرائم یا گناہ اس نے کئے ہوتے ہیں، بخش دیئے جاتے ہیں لیکن مغفرت کے اس مفہوم کو اگر درست تسلیم

کر لیا جائے تو قانونِ مکافاتِ عمل، جو دینِ اسلام کی بنیاد ہے، غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ کوئی عمل اچھا ہو یا بُرا، نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک دوسری جگہ فرمایا کہ "کائنات کا یہ سارا سلسلہ سرگرمِ عمل ہی اس لئے ہے کہ ہر کام کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہو جائے" (۲۱/۱۶)؛ (۴۵/۲۲)۔ لہٰذا جب یہ معلوم ہو گیا کہ ہر عمل کا نتیجہ اٹل ہے تو پھر مغفرت کا مندرجہ بالا مفہوم (بخشش) خود بخود باطل اور بے معنی ہو کر رہ گیا۔ جو صاحبِ علم مغفرت کو بخشش کے معانی پہناتے ہیں ان کے نزدیک مستقل اقدار پر عمل یا ان کی خلاف ورزی میں کوئی فرق نہیں رہتا اور وہ انسانی اعمال کے اٹل نتائج کو تسلیم نہیں کرتے۔

قارئین کرام! ہمیں کسی کے خلوص پر کوئی شُبہ نہیں۔ البتہ جو حضرات بھی ایسا خیال کرتے ہیں ان کے ذہن میں خدا کا عجمی تصوّر ہوتا ہے۔ وہ خدا کو ایک ڈکٹیٹر، مستبد حاکم یا مطلق العنان بادشاہ سمجھتے ہیں جو خوش ہو جائے، تو گاؤں کے گاؤں انعام میں بخش دے۔ غصّے میں آجائے تو بستیوں کی بستیاں برباد کر دے، دل چاہے تو ساری عمر کی عبادت، نیکیاں اور ثواب ضائع کر دے اور اگر مرضی پر آجائے تو اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دے۔ لہٰذا اس کی عنایات و خوشنودی کے لئے لازم ہے کہ نذر نذرانوں اور دیگر 'وسیلوں' کے ذریعہ اس کا قرب حاصل کیا جائے۔ بلند مراتب اور درجات کے حصول کے لئے کثرت سے 'ذکر و تسبیح' اور استغفار کا ورد کیا جائے۔ عجمی خدا چاہے تو چوروں کو قطب بنا دے۔ اس کی پیشانی پر بل آجائے تو ولیوں کو گمراہی کے گڑھے میں دھکیل دے۔ کوئی اُسے پوچھنے والا نہیں۔ الغرض انسانی نفع و نقصان کا دارو مدار خدا کے موڈ کے اتار چڑھاؤ پر منحصر ہے۔ لیکن اِس کے برعکس اسلام میں خدا کا تصوّر بالکل مختلف ہے۔ وہ مستقل اور اٹل اصول و قوانین کا خدا ہے۔ اس کے سلسلۂ کائنات میں قانون کی کارفرمائی ہے۔ اس کی عبادت اس کے احکام کی محکومیت کا نام ہے۔ یہ وہ خدا ہے جو ہمیں مستقل اقدار (قرآن) عطا کرتا ہے جن پر عمل کر کے ہم حیوانی سطح سے اُبھر کر انسانی سطح پر زندگی گذارنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ یہاں انسان کو کوئی چیز بھی بخشش کے طور پر نہیں ملتی۔ بلکہ وہی کچھ ملتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے اور یوں بھی ایک مردِ مومن کی شان کے شایاں نہیں ہے کہ اسے ہاتھ پیر ہلائے بغیر مفت میں کچھ حاصل ہو جائے۔ بقول علامہ اقبالؒ۔

خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

عجمی خدا نے اپنی بہشت کے لئے جو اصول وضع کئے ہیں وہ بڑے آسان ہیں اور ان پر عمل بھی کچھ مشکل نہیں۔ مثلاً کسی مخصوص قبرستان (بہشتی مقبرہ) میں مُردے کی تدفین۔ زندگی میں ایک بار 'بہشتی دروازہ' سے گذر جانا۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ یا کلمہ شریف پڑھ لینا۔ یعنی بہت ہی معمولی معمولی باتوں پر عجمی خدا جنّت بخش دیتا ہے لیکن اسلام کا پیروکار (مردِ مومن) ایسی جنّت کے متعلق کیا خیال کرتا ہے۔ وہ علامہ اقبالؒ کی زبانی سنیئے:

بچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر سے
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر سے
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

کیوں نہ ہو۔ وہ جانتا ہے کہ ایسی فرضی اور سستی جنت ایک مذاق ہے اور حقیقی جنت وہی ہے جو ایک مسلمان کو اپنی جان اور مال اللہ کی راہ پر قربان کر دینے سے ملتی ہے۔

قارئینِ محترم! یہ تھا عجمی خدا کے تصور کے مقابلہ میں حقیقی (قرآنی) خدا کے تصور کا ایک مختصر سا جائزہ۔ اس تصور سے انسانوں کا وہ خود ساختہ خدا ختم ہو جاتا ہے جو بخشش اور بخشنہار کی صفات کا حامل ہے اور جو مصلّے پر بیٹھ کر محض 'تسبیح' کے دانوں پر اپنے نام کے ورد سے ہی خوش ہو جاتا ہے۔

بات کیا تھی، کہاں سے چلی اور پھر کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ کسی قرآنی اصطلاح کا غلط مفہوم کس طرح سارے نظام (دین) کی غرض و غایت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ آپ نے دیکھ لیا ہو گا۔ البتہ مجھے جس بات نے 'مغفرت' کے موضوع پر کچھ تحریر کرنے پر آمادہ کیا وہ ایک اشتہار ہے جو روزنامہ جنگ مورخہ ۹۲/۶/۷ کی اشاعت میں شائع ہوا یہ اشتہار کسی نامعلوم شخصیت یا ادارہ کی جانب سے معلوم ہوتا ہے۔

جو اپنا آپ راز میں رکھنا چاہتا ہے۔ اشتہار کی خاص اور توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس میں اجتماعی استغفار کرانے کے عمل کو حضرت عمرؓ فاروق سے منسوب کیا گیا ہے اور ان کی تقلید میں آج پاکستان میں بھی اجتماعی مندے کو روکنے کے لئے استغفار پڑھنے اور دل سے استغفر اللہ کہنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت عمرؓ جس نے حسبنا کتاب اللہ کا علم بلند کیا تھا' نے اپنے دورِ خلافت میں بہت سی معاشی، معاشرتی اور فوجی اصلاحات نافذ کیں جو آج بھی مشاہیرِ عالم کے لئے قابلِ تقلید ہیں۔ یہی وہ خلیفۃ المسلمین ہیں جنہیں دین کے بڑے بڑے سکالروں نے شاہکارِ رسالت کا خطاب دیا ہے۔ فکر و عمل کے اس پیکر کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ قحط کے دوران اجتماعی استغفار کرایا کرتے تھے، نہ صرف مہمل خیالی ہے بلکہ ان پر بلے سر و پا الزام کی بھی جسارت ہے۔ ان کے متعلق تو مشہور ہے کہ وہ عام حالات میں بھی آٹے کی بوریاں محتاج لوگوں کے گھروں میں پہنچایا کرتے تھے۔ چہ جائیکہ قحط سالی سے دوران ہاتھ پر ہاتھ دھرے اجتماعی استغفار کا اہتمام کرتے پھریں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسے موقع پر ایک طرف تو انہوں نے باہر سے غلہ منگوایا' اس کے سٹاک اور تقسیم کا انتظام کیا' تو دوسری طرف راشن کے استعمال کے لئے بھی احکام نافذ فرمائے۔ مثلاً انہوں نے لوگوں کو فرداً فرداً کی بجائے اجتماعی طور پر اکٹھے مل کر کھانا کھانے کی ترغیب دی تاکہ تھوڑی خوراک زیادہ انسانوں کے لئے کافی ہو سکے۔ اس پر انہوں نے خود بھی عمل کیا اور دوسروں کو بھی مائل کرنے کی کوشش کی۔ تاریخِ عالم اور اسلام کی ایسی منفرد ہستی کے متعلق مورخ لکھتے ہیں کہ اگر ایک عمرؓ اور پیدا ہو جاتا تو

آج ساری دنیا کا نقشہ مختلف ہو جاتا اور پھر ایک اور بات کہ اگر اشتہار کے مصنف کے بقول حضرت عمرؓ قحط جیسی آفت استغفار کی پھونکوں سے ٹالنے کے قائل ہوتے، تو مخالفین کو حضرت عمرؓ کو راستہ سے ہٹانے کی کبھی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ ایک حقیقت پسند اور محکم شخصیت کے مالک تھے۔ سابقہ اقوام کے عروج و زوال اور قرآن کے اصول و قوانین کے نتائج و اثرات سے خوب واقف تھے۔ ان حالات میں لوگوں کو یہ بتانا کہ حضرت عمرؓ اپنے قحط زدہ ملک کو استغفار کے دم درود سے بچایا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ اور اسلام سے ناواقفیت کی علامت ہے۔ اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ اشتہار کے فاضل مصنف استغفار کے پڑھنے کا یہی نسخہ پاکستان کے اجتماعی مندے کے تدارک کے لئے بھی آزمانا چاہتے ہیں۔ خدا ہمارے ملک کو ایسے حاذق حکماء سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

جہاں تک استغفار کرانے، پڑھنے یا استغفر اللہ کہنے کا تعلق ہے۔ اسے صحت کے ایک مسلّمہ اصول کی مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جو شخص کمزور ہو جاتا ہے اس پر بیماری فوراً حملہ کر دیتی ہے۔ اس میں قوتِ مدافعت باقی نہیں رہتی۔ وہ جراثیم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اس میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ وہ ان جراثیم کا مقابلہ کر سکے۔ اس قسم کی طاقت اپنے اندر پیدا کر لینا استغفار ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تسبیح کے دانوں پر استغفر اللہ، استغفر اللہ کے الفاظ دہرانے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسے کام کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے جس سے انسانی صلاحیتوں میں نشوونما پیدا ہو جائے۔

قارئین کرام! مذکورہ اشتہار کی اشاعت کسی مذہبی تنظیم نے کی ہو یا کسی فردِ واحد نے۔ ایک بات یقینی ہے کہ اس سے اس تھیاکریسی کی عکاسی ضرور ہوتی ہے جس سے قائدِ اعظمؒ پاکستان کو بہر صورت محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسی تھیاکریسی اور مملکتِ خداداد میں کوئی مشترکہ شق قائم نہیں رہ سکتی جس طرح حق و باطل آپس میں متضاد ہیں۔ اسی طرح ضابطۂ خداوندی پر خود ساختہ قوانین کا ٹانکہ بھی نہیں لگ سکتا۔ مستقل اقدار فکر و عمل کا تقاضا کرتی ہیں جب کہ مذہبی پیشوائیت کے اندھے منشور کے لئے 'اعمالِ قرآنی' پر 'اخلاص و اعتقاد' ہی کافی ہے۔ مجھے ایک صوفی نما بزرگ سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اپنے دوستوں سے گفتگو کے ساتھ ساتھ اپنی رنگین تسبیح کے دانوں پر کچھ ورد بھی کرتے جا رہے تھے۔ میں نے انجان بنتے ہوئے اس عمل کا مقصد پوچھا، تو فرمانے لگے کہ خدا کے پاس اگلے جہان کے لئے زرِ مبادلہ بھیج رہا ہوں۔ ان کے اس جواب سے مجھے اغیار (یہود و نصاریٰ) کی وہ سازش یاد آ گئی جس سے وہ اسلام کی فکر و عمل کی راہیں کھرچ کر خود تو تسخیرِ کائنات میں لگ گئے اور ہمارے ہاتھ میں رنگین دانوں کی خوشنما تسبیحیں تھما دیں تاکہ مصلّوں پر بیٹھ کر ہم خدا کے 'ذکر و تسبیح' کا ورد مکمل کرتے رہیں۔

حیراں ہوں روؤں دل کو یا پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

نامے جو میرے نام آتے ہیں

(ایڈیٹر طلوعِ اسلام)

گرامی قدر! اسلام و رحمۃ۔

جولائی کے شمارے میں "استفسارات" کے باب میں ایک صاحبِ جگر افگار نے اپنی قوم کی شعلہ مزاجی پر کرب و الم کا اظہار فرمایا ہے۔ مدت ہوئی غالب نے اس کا علاج کچھ یوں بیان کیا تھا

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

لیکن یہ شعر اتنا آسان نہیں کیونکہ غالب نے اصل بات کو "حکمتِ دل" میں پنہاں کر دیا ہوا ہے۔

الفاظ کا مزاج اور ان کی غرض و غایت سے جب تک آشنائی حاصل نہ ہو انسانی اعمال و افعال جذبات کی زد پر ہوتے ہیں۔ "قانون" بھی ایک لفظ ہے جس کا مزاج پتھر کی طرح سخت اور اس کی غرض و غایت یہ کہ اس کا احترام دل کی گہرائیوں سے کیا جائے بصورتِ دیگر پتھر مزاجاً سنگ ہی تو ہوتا ہے۔

مدتِ بعید سے ہم نے یعنی ہم مسلمانوں نے الفاظ کے مزاج اور ان کی غرض و غایت سے ناطہ توڑ رکھا ہے بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ مذہب کے بخار میں پھنکنے کی حد تک ایسے مبتلا ہوئے کہ ذہن قابو میں نہ رہا اور تب اول فول بکنے لگے ـــ ذہن قابو میں نہ ہونے کے باعث دیوانگی کے عالم میں "سنگ" جیبوں میں بھر لئے۔

کہتے ہیں کہ الفاظ برف کی طرح سرد بھی ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی انگارے نگلنے والا ہنرمند باحکمت ہاتھوں سے ان سرد الفاظ کی پٹیاں مسلمانوں کی پیشانیوں پر رکھنے کی جرأت کرے، تو اسی مذہب کے پھنکتے ہوئے بخار کی تپش ان الفاظ میں زندگی کی لہر دوڑا سکتی ہے۔ زندگی کی لہر کے اُبھرنے سے مسلمان یقیناً لفظ "قانون" کی کنہ و حقیقت سے آشنائی حاصل کریں گے ـــ کہ ـــ قانون بنیادی طور پر لائحہ عمل حیات ہی ہے۔ اور جب اس کا احترام دل کی گہرائیوں سے ہونا شروع ہو جائے گا۔ تب شعلۂ آتش کو ریشم میں لپیٹنا کوئی مشکل نہ ہوگا کیونکہ تب ہمیں حقیقی

ریشم میسر آجائے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ:

"حق کو باطل کے ساتھ مخلوط مت کرو، حق کو اسی طرح بیان کرو جس طرح تم اس کو جانتے ہو۔" (۲/۴۲)

کہ نائیلون ریشم نہیں ہو سکتا بلکہ اول فول ہی ہے۔ یہ کوئی الف لیلوی قصہ کہانی نہیں ہے۔ مغرب اس رمز کو پا کر اس پر عمل پیرا بھی ہے۔ اسی رمز کی رُو سے بلکہ اس حکمتِ عملی سے افراد کو، فکرِ فرد سے آزاد کر دیا ہے اور کوئی مذہب ان اقوام میں پنپ ہی نہیں سکتا۔ اس طرح افراد کی شعلہ مزاجی زود رنجی اور قوتِ برداشت معاشرے کی ذمہ داری ہو گئی ہے۔ اب ان کی بہل گیدڑ کی ہوتی ہے اور پچھاڑ شیر کی۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

فقط
خیر اندیش، محمد اسلم رانا۔

محترم ایڈیٹر صاحب!

میں ہمیشہ سچ بولنا چاہتی ہوں مگر اکثر حالات اس کے موافق نہیں ہوتے اور پھر مصلحتاً میں اس سے گریز کر جاتی ہوں باوجود اندر کی مخالفت کے۔ پتہ نہیں یہ زمانے کا رنگ ہے یا کمزور قوتِ ارادی۔ دکھ مجھے اس بات کا ہے کہ میں قرآن کی طالبہ ہوں، سب کچھ سمجھنے بوجھنے کے باوجود میرے اندر ایمان کی پختگی نہیں۔ نیکی کے لئے تڑپ، جذبہ لگن، عشق، محبت، جستجو کچھ بھی تو نہیں۔ میری نمازیں پھیکی، بے روح اور بے رنگ ہوتی ہیں۔ بہت دنوں پہلے مجھے کسی قدر سکون ملتا تھا یہ سب کام کر کے مگر آجکل پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ عجیب بے نام سی بے حسی یا پتہ نہیں کیا چیز مجھ پر مسلط ہے۔ حالانکہ میں ہر روز مفہوم القرآن پڑھتی ہوں، سمجھتی بھی ہوں شاید مگر پتہ نہیں عمل کیوں نہیں کرتی۔ ڈر بھی لگتا ہے۔ سوچتی بھی ہوں مگر صرف سوچنے کی حد تک۔ جب میں اپنے ایمان کی پختگی کی اللہ سے دُعا مانگتی ہوں تو خود بخود مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں شاید اللہ کو بظاہر اور بباطن اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی ہوں خوبصورت لفظوں سے۔ OTHERWISE میرے اندر سے ایسی شاید کوئی آواز اٹھ نہیں رہی۔ یہی ماجرا، یہی کیفیت مجھے اب آپ کو خط لکھتے ہوئے محسوس ہو رہی ہے کہ شاید میں آپ کو بھی.....

آپ کی بیٹی
ش۔ الف۔ سرگودھا۔

محترم ایڈیٹر صاحب!

السلام علیکم۔ ڈرتے ڈرتے قرآنی فیصلے کتاب کو ہاتھ لگا ہی لیا مگر دل کو تھام کر کہ کہیں پٹڑی سے نہ اُتر جاؤں اور میں واقعی پٹڑی سے اُتر گیا۔ کیونکہ صراطِ مستقیم کا جو خاکہ میرے اپنے ذہن میں اُبھر رہا تھا اس کی عکاسی طلوعِ اسلام سے ہوگئی۔ آج سے مجھے اپنا رکن سمجھئے۔

صوبیدار بشیر احمد جنجوعہ۔

برائے توجہ

پیشگی خریداری کھاتہ داران/خریداران مطبوعاتِ طلوعِ اسلام ٹرسٹ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ اور ادارہ طلوعِ اسلام کے حسابات مکمل طور پر الگ الگ ہیں لہٰذا جملہ کھاتہ داران و خریداران مطبوعاتِ طلوعِ اسلام ٹرسٹ سے گذارش ہے کہ کتب و پرویزؒ صاحب کے درسِ قرآنِ کریم کے آڈیو/وڈیو کیسٹ کے لئے مرسلہ رقوم صرف حسبِ ذیل نام سے بھیجیں۔

"طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

اکاؤنٹ نمبر ۳۵۔ ۴۱۰۷۔ حبیب بنک لمیٹڈ

مین مارکیٹ برانچ۔ گلبرگ II لاہور"

اس طرح بھیجی گئی رقوم بلا تاخیر آپ کے کھاتہ میں جمع ہو سکیں گی اور ہمارے لئے ایکسپورٹ پرمٹ کا حصول آسان ہو جائے گا اور آپ کے آرڈرز کی تعمیل بسرعت ممکن ہو سکے گی۔

ڈاکٹر زاہدہ دُرّانی

سربراہ طلوعِ اسلام ٹرسٹ

جمہوریت

مغربی نظامِ جمہوریت میں، عوام کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ عوام کے نمائندے، جس قسم کا آئین جی چاہے مرتب کریں۔ اور جس قسم کے قوانین جی چاہے وضع کریں، ان کے اس اختیار پر کوئی پابندی عاید نہیں کی جا سکتی۔ اس کے برعکس اسلامک اسٹیٹ میں امت کے نمائندے مملکت کا آئین اور حکومت کیلئے قوانین باہمی مشاورت سے ان حدود کے اندر رہتے ہوئے وضع کر سکتے ہیں جو کتاب اللہ نے متعین کی ہیں۔ کتاب اللہ کی یہ حدود غیر متبدل رہتی ہیں۔ اور ان کے اندر رہتے ہوئے مرتب کردہ قوانین و ضوابط، حالات کے تقاضے اور زمانے کی ضرورتوں کے مطابق بدلے جا سکتے ہیں۔ ان قوانین و ضوابط کو شریعت کہا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر اسلامی مملکت میں دین تو غیر متبدل رہے گا۔ لیکن شریعت بدلتی رہے گی۔ یہ شریعت، مرتب کردہ ہوگی امت کے نمائندوں کی۔ اس لئے اسلامک اسٹیٹ میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں ہوگا۔ لہٰذا یہ اسٹیٹ تھیاکریٹک بھی نہیں ہوگی۔

قانون سازی کے سلسلہ میں قرآن کریم نے ایک عظیم حقیقت بیان کی ہے۔ ہر حکومت کا بنیادی فریضہ عدل قرار دیا جاتا ہے اور عدل سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ جو فیصلہ ملک کے مروّجہ قانون کے مطابق ہو وہ عدل (JUSTICE) ہے۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے جو فیصلہ قانون کے مطابق ہو اسے عدل کہا جائے گا لیکن اگر وہ قانون ہی ایسا ہے جو ظلم پر مبنی ہے تو اسی کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جا سکے گا؟ لہٰذا دیکھنے کی بات یہ ہوگی کہ وہ قانون کس قسم کا ہے۔ مغربی اندازِ حکومت کی رُو سے دیکھا صرف یہ جاتا ہے کہ جو قانون ملک میں نافذ کیا جا رہا ہے وہ مملکت کے آئین اور قانون سازی کے ضوابط پر پورا اترتا ہے یا نہیں اگر وہ قانون ان شرائط کو پورا کرتا ہے تو وہ جائز (VALID) قرار پائے گا اور اس کے مطابق، متنازعہ فیہ معاملات کے فیصلے مبنی پر عدل تسلیم کئے جائیں گے۔ لیکن قرآن کی رُو سے کسی قانون کے جائز یا ناجائز قرار پانے کا صرف یہی معیار نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان تمام شرائط کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوگا کہ وہ قانون ان مستقل اقدار و اصول کے بھی مطابق ہے یا نہیں جو کتاب اللہ میں مذکور ہیں۔ اگر وہ ان کے مطابق ہے تو وہ جائز

قانون ہے۔ اگر ان سے ٹکراتا ہے تو ناجائز ہے خواہ وہ آئینِ مملکت کی تمام شرائط کو بھی پورا کیوں نہ کر رہا ہو۔ اس کا اعلان یہ ہے کہ اسلامی مملکت وہ ہے جس کا انداز یہ ہو کہ یَهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ۔ (۷/۱۸۱) وہ الحق کے مطابق لوگوں کو چلاتی ہے اور اسی کے مطابق عدل کرتی ہے۔ الحق (THE TURUTH) قرآن کی رُو سے وحیٔ خداوندی کو کہا جاتا ہے۔ جو مملکت ایسا کرتی ہے وہ اسلامی مملکت کہلاتی ہے۔ جو ایسا نہیں کرتی وہ سیکولر (غیر اسلامی) ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سیکولر کا کوئی مفہوم نہیں۔

(ماخوذ از طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۷۳ء)

بہترین
دوست وہ ہے جب تم اللہ کو یاد کرو
وہ تمہاری مدد کرے اور جب تم اللہ کو بھلا دو تو وہ یاد دلائے۔
حدیثِ نبوی

بہترین مومن وہ ہے جس کا اخلاق بلند ہو اور اہل و عیال کے
ساتھ محبت اور مہربانی سے پیش آتا ہو۔
حدیثِ نبوی

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

اپنی کمائی

— ۲ —

جب اسلام، کوشش اور عمل کی اس قدر تاکید کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ کسی شخص کا خود کچھ کام نہ کرنا اور دوسروں کی پر زندگی بسر کرنا اسلام کے نزدیک کس قدر بُرا ہو گا؟

اپنی کمائی دوسروں کی کمائی پر گزارہ کرنے والوں کو عربی زبان میں 'مترفین' کہتے ہیں. قرآنِ کریم کی کئی ایک آیتوں میں لکھا ہے کہ مترفین، خدا کے دین اور اس کے رسولوں کے دشمن ہوتے ہیں. وہ سہل انگار اور سُست ہو جاتے ہیں. وہ محنت کرنے اور خود کما کر کھانے سے جی چراتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے محنت کریں اور وہ مفت کی کھاتے رہیں. قرآن کریم ایسے لوگوں کی سخت مخالفت کرتا ہے. وہ مومنوں کو تاکید کرتا ہے کہ

رزق کی تلاش

فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ (۲۹/۱۷)

"خدا کے مقرر کئے ہوئے قاعدے کے مطابق رزق کی تلاش کرو."

جائز طریقے سے رزق "خدا کے مقرر کئے ہوئے قاعدے" سے یہ مراد ہے کہ رزق کو جائز طریقے سے حاصل کرو. ناجائز طریقوں سے مت حاصل کرو.

وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ۵ (۲/۱۸۸)

"آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔"

ناجائز رزق

دھوکے، فریب یا چوری سے دوسرے کا مال لے لینا یا کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا، دوسرے کی محنت کی کمائی کو خود لے جانا، کسی کے حق میں کمی کر دینا، سب ناجائز طریقے ہیں۔

کتابیں

(جو ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور II سے بھی دستیاب ہیں)

نام کتاب	مصنف/مؤلف	صفحات	قیمت
۱۔ اشاریہ مجلہ طلوعِ اسلام	خادم علی جاوید	۵۴۰	۱۲۰،۰۰ روپے
۲۔ آیاتِ بیّنات	ثریا عندلیب	۳۱۲	۹۹،۰۰ "
۳۔ کُن فیکون	صابر صدیقی	۴۸۰	اخباری کاغذ ۱۲۰،۰۰ "
			سفید کاغذ ۱۵۰،۰۰ "
۴۔ مجلہ طلوعِ اسلام (مجلد)	ادارہ	۱۲ شمارے	۱۲۰،۰۰ "
۵۔ جنگِ خلیج کی تباہ کاریاں اور عالمِ اسلام کا مستقبل	محمد اشرف ظفر	۴۷۸	سٹوڈنٹ ۸۰،۰۰ "
			لائبریری ۱۳۰،۰۰ "
۶۔ رونا چھوڑیئے۔ جینا شروع کیجئے۔	مسز جان فردوس	۴۶۰	۱۵۰،۰۰ "
۷۔ غلام احمد پرویزؒ (ایک تعارف)	قاسم نوری	۱۲۸	۲۵،۰۰ "

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

EARNINGS

As Islam lays great stress on a life of strife and struggle, it is apparent that to live on other people's earnings is considered to be too bad. Those who live on other people's earnings are called " *MUTRAFEEN* " in Arabic language. As pointed out in so many verses of the Holy Quran " *Mutrafeen* " are the enemies of God's messengers and of (*Deen*) the way of life brought about by them. These are idle and lazy people who avoid work and self earning. They would like that other people may earn and they themselves remain parasites on their earnings. The Quran is deadly against such people and instructs the believers:

"Then you seek your sustenance according to the way prescribed by Allah."

What is meant by the way prescribed by Allah ? It means the ways of earning that are lawful according to the Quran. On the other hand unlawful means are strictly prohibited:

"And do not eat up your property among yourselves, by unlawful means."

What are these unlawful means? It means to get other people's wealth by fraud, by stealing, or by taking advantage of somebody's weakness, or to usurp somebody's earnings or to cut down from what is due to another person.

Dear Children !
As-Salam-o-Alaikum Wa Rahmatullah,
I will be too glad to hear from you about these pages.
Please do write to me.
Editor

INTIMATION

At the request of our subscribers we have started publishing excerpts from letters to the Editor under Head " NAME MERE NAM ATTE HEIN". Readers are free to express their views in consonance, of course, with the teachings of the Holy Book.

worry about their schemes. Surely, *Allah* is with those who are *muttaqeen* and *muhsineen*."

[4] Guarantee of Success

(16:84-85) "The present state of affairs will not continue indefinitely. A change is sure to come. People will not come from outside to bring it about, but some from amongst them will bear witness to the truth of the Divine system. Those who oppose it will not be permitted to offer excuses nor shall they have oppurtunity to make amends. Their chastisement will not be made lighter nor shall they be granted any respite."

(16:92) "Do not be like the woman who unspins her yarn after she has spun it with great labour ... Mark! The position of a nation does NOT remain static: changes take place occasionally ..."

(17:58) "These people (the mushrikeen) think that the system they have devised is so strong that none can touch them. Tell them that NO system built on wrong foundations will last forever. It will be destroyed here in this world or its upholders will be subjected to grievous chastisement. This is all laid down in the Book containing the law of *Mukaf'at*."

(17:81) "O *Rasool*: announce to the WHOLE WORLD that truth has manifested itself and falsehood has vanished; for falsehood by its very nature MUST perish eventually."

[5] Security and defence

(16:98) "O *Rasool*, when you embark on your programme for the establishment of the *Qur'anic* order, be very careful of your opponents and procure every means of protection against their schemes (17:64-65)."

(16:126) "If they do you any harm and it becomes inevitable to take revenge then do so to the extent to which you have been harmed. But if you can endure the wrong with forbearance, it will produce BETTER results at the end."

[6] Alliances

(1:4) "... We do NOT accept or acknowledge ANY authority but that of *Allah*, NOR do we seek alliance with ANY system which disregards the Divine Laws."

[7] Methods of Propagation

(17:53) "O *Rasool*, you should ask those who have submitted to *Allah*'s laws to speak GENTLY to the unbelievers and to each other for *Shait'an* is always on the lookout as to how he may create dissension amongst you. *Shait'an* is man's avowed enemy."

(17:81) "O *Rasool*: announce to the WHOLE WORLD that truth has manifested itself and falsehood has vanished; for falsehood by its very nature MUST perish eventually."

(17:106) "Since the intention was that people should accept the *Qur'an* after being CONVINCED of its truth, We descended it not in its entirety, but PIECEMEAL so that you may present it to them with SLOW deliberation."

SYED MUSTAPHA ALI

ORGANIZATIONAL GUIDELINES FROM AL-QUR'AN

[1] Goal: Deliver the message

(16:37) "O *Rasool*, We know that you ardently desire that these people should take the right path (18:6, 28:56). Those who deliberately go astray CANNOT be compelled to follow the right path. They shall have to face the consequences of their actions and no one will be able to help them."

(16:77) "O *Rasool*, you continue explaining these realities to these people. If they do not accept them despite your efforts, do not worry as to when the promised end will come. That hour will be but the twinkling of an eye or less. *Allah* has devised measures for all things (20:15, 53:31)."

(16:125) "O *Rasool*, do not entangle yourself with them. You continue your programme of inviting people to the way of *Allah* with wisdom and KINDLY exhortation and discuss matters with them in the BEST possible manner. *Allah* knows best who is following the right path and who has gone astray (12:108)."

[2] Programme

(17:78-79) "This (ie: the establishment of the *Qur'anic* social order) will not, however, happen automatically. You will have to strive hard for it. You will have to follow a definite programme. Before the day dawns (ie: before SUNRISE), set out your schedule for the whole day in the light of the *Qur'an*, since that time is very congenial for such deliberation. Then from the dawning of the day to the evening, follow it practically. In the early hours of the night, consult with your companions (73:20). In the late hours of the night, you may rise if necessary - this is, however, voluntary devotion for you.

If you and your companions follow this program assiduously, you will soon attain an exalted position of praise and glory in the eyes of the whole world."

[3] Patience and perseverance

(16:41-42) "Those who leave their homes due to persecution, *Allah* will surely provide them with a better place in this world and a greater reward in the hereafter, if only they could realise this. They are the people who faced their trials steadfastly and had full trust in their *Rabb*."

(16:110) "Those who remain steadfast in their *iman* confront various trials, suffer persecution, are forced to leave their homes, strive in the cause of *Allah* and endure all tribulations with perseverance - for them their protection from their *Rabb* and His *Rahmat*."

(16:127-128) "... adhere to your programme steadfastly. This will be possible only through the help which you receive from *Allah*. Do not grieve about the unbelievers and do not